رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نومبر ۵۰

نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ار

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ مجلد رسات روپیہ آٹھ آنے (معہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعاء توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت و ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز۔
قیمت علاوہ محصول یا بچروپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرت اور پاکیزگی خیال کے بہترین نمونے ملیں گے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپکو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے جھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ بحث کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مہربانی فرما کر یہ پورا صفحہ پڑھ لیجئے

داہنی طرف نشان (X) دیکھ لیجئے

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہو گیا۔ اگر آپ ہندوستان میں ہیں تو آئندہ پرچہ ذریعہ وی۔ پی بھیجا جائے گا، لیکن اگر آپ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ اپنا چندہ چھ روپیہ (پاکستانی سکہ) ہمارے نمائندہ کو حسب ذیل پتہ سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کر کے ہم کو اطلاع دیجئے تاکہ نگار جاری رکھا جائے۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ ۲۲۲ پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول۔ کراچی

پاکستان میں ہماری کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ

پاکستانی حضرات خواہ وہ ایجنٹ ہوں یا نگار کے خریدار یا دوسرے کرمفرما ہماری کتابیں اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیجدیں، ہم کتابیں ان کو ذریعہ رجسٹری بھیجدیں گے اور وہ انکی قیمت ہمارے حسب ذیل نمائندوں میں سے کسی کو دست بدست دیدیں گے یا ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے۔

۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ ۲۲۲ پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول کراچی۔ ۲۔ حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور

"نگار" کا آئندہ سالنامہ

ایک مستقل کتاب ہوگی

جس میں اسوقت کی تمام اہم مسلم حکومتوں کے سیاسی و اقتصادی مسایل پر روشنی ڈالی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ عہدِ حاضر کی مسلم آبادی جو ایران سے لیکر مقدونیہ و عراق تک پھیلی ہوئی ہے کس دور سے گزر رہی ہے اور کس قدر بے چینی کے ساتھ

ایک مستقبل کی تلاش میں سرگرداں ہے

نگار کا یہ سالنامہ، تمام پچھلے سالناموں سے بالکل مختلف نوعیت کا ہوگا اور اس میں بجائے شعر و ادب کے زندگی کے ان مسایل پر گفتگو کی جائے گی جن کے سمجھنے پر قوموں کی موت و زندگی کا انحصار ہے۔ یہ سالنامہ گویا وقت کی پکار ہے۔

سالنامہ میں حضرت نیاز فتحپوری کا طویل مقالہ سیاسیات مشرق وسطیٰ پر خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کی چیز ہوگا۔

اس سالنامہ کی قیمت سالانہ خریداروں سے زاید نہیں لی جائے گی، لیکن جو حضرات صرف سالنامہ لینا چاہیں گے ان کو فی کاپی دو روپیہ چھ آنے معہ محصول ڈاک ادا کرنا ہوگا۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن، جدّہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمدورفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کرسکیں گے

مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارریسن اینڈ کمپنی

۱۶۔ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "من و یزداں" کے دونوں حصے تیرہ روپئے (۱۳ھ) میں معہ محصول حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ

غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے کیونکہ اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور آئندہ اتنی بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں "من و یزداں" ایک صحیفۂ انسانیت ہے جس کے مطالعہ کے بغیر آپ مذہب کی صحیح روح نہیں سمجھ سکتے۔ منیجر نگار

رعایتی قیمت

مجموعۂ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات جسکی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن اب آپ کو معہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ منیجر نگار۔

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، مانتا: ماننا آپ کا فعل ہے۔

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے، ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کیلئے اکسیر صفت ہے جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور گستہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اسقدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو حسب آب حیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے، ایک ہفتہ تک چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کرے گی اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے متعلق تھکن نہ ہوگی یہ دوا فسادوں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا ہی نہیں ہے بلکہ ہزاروں بیماروں کا علاج اس کے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۲۴ خوراک چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا خانہ مفت منگائیے۔

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔

نقالوں سے ہوشیار رہئے میری ۳۱ سالہ شہرت پر غور فرمائیے

پتہ:۔ حکیم ثابت علی شیخ زبان، خوش کلام

(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر نمبر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

سردی کو روکئے

اس سے آگے خطرہ ہے!

● سردی کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیجئے۔ یہی سردی بڑھ کر نمونیہ میں تبدیل ہو سکتی ہے اسلئے سردی کا احساس ہوتے ہی اسے روکئے

سُعالین

کی ایک ٹکیہ منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ چوسئے۔ یہ نہ صرف سردی سے محفوظ رکھے گی، گلے کو صاف کرے گی بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں توازن پیدا کرے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی۔

قیمت فی شیشی صرف بارہ آنے

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

سیاحت و سوانح

سفرنامہ برما --- ابوظفر ندوی --- دو روپیہ آٹھ آنہ
سفرنامہ حرمین شریفین --- مولانا محی الدین --- تین روپیہ
حیات خسرو --- سعید مارہروی --- ایک روپیہ آٹھ آنہ
سیرت آل عباس --- فرید احمد عباسی --- دو روپیہ
سیرت رسول اللہ --- نواب علی --- چار روپیہ آٹھ آنہ
حیات مصطفےٰ کامل پاشا --- دو روپیہ
حیات طیبہ --- غازی الدین --- دو روپیہ
سفیر اودھ --- مسیح الدین --- ایک روپیہ آٹھ آنہ
صراط الحمید ۲ حصے --- الیاس برنی --- چار روپیہ
بیان خسرو --- علامہ شبلی --- ایک روپیہ
سیرت احمدی --- احمد حسین خاں --- تین روپیہ
سیرت النعمان --- علامہ شبلی --- دو روپیہ آٹھ آنہ
حیات محمد علی جناح --- رئیس احمد جعفری --- آٹھ روپیہ
سوانح پیغمبر اعظم --- مولانا فضل اللہ --- ڈھائی روپیہ
سفر سعادت --- امیر احمد علوی --- ایک روپیہ آٹھ آنہ

ناول، افسانے و ڈرامے

اصنام خیالی --- جلیل احمد قدوائی --- ڈھائی روپیہ
سیر گل --- " " " --- دو روپیہ
مونا دانا --- " " " --- ڈیڑھ روپیہ
افسانہ کی حقیقت --- ظفر واسطی --- ڈھائی روپیہ
انقلاب فرانس --- ہاری --- ایک روپیہ آٹھ آنہ
بم کا نسخہ --- قاضی عدیل عباسی --- ڈھائی روپیہ
پلکوں میں آنسو --- صدیقہ بیگم --- تین روپیہ
پھول کماری --- کیفی --- ایک روپیہ
جورِ فلک (ناور) انعام اللہ خاں --- بارہ روپیہ
شریر بیوی --- عظیم بیگ چغتائی --- دو روپیہ آٹھ آنہ
حب وطن کے تقاضے --- پریم چند --- ڈیڑھ روپیہ
درد --- احمد حسین خاں --- ڈیڑھ روپیہ
وہ عورت جس نے کر دکھایا --- " " --- ڈیڑھ روپیہ
سنہری لاش --- تیرتھ رام فیروز پوری --- پانچ روپیہ
قاتل ہار --- " " " --- چار روپیہ
مہر خموشی --- " " " --- تین روپیہ آٹھ آنہ
نقلی نواب --- " " " --- دو روپیہ آٹھ آنہ
مصنوعی انسان --- " " " --- ایک روپیہ آٹھ آنہ
شباب لکھنؤ --- احمد علی --- دو روپیہ آٹھ آنہ
طاہرہ --- شرر لکھنوی --- دو روپیہ آٹھ آنہ
ہندوستان ہمارا --- بلونت سنگھ --- تین روپیہ آٹھ آنہ
کنولا --- دو حصے --- شفیع خاں نمیر --- دو روپیہ آٹھ آنہ

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی) مرزا شوق، جانعالم واجد علیشاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ ان کی مثنوی کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

اعلان صفحہ (۸) ضرور ملاحظہ فرمایئے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۸ | فہرست مضامین نومبر ۱۹۵۰ء | شمار ۵

ملاحظات ---------- ۵

اظہار اعداد کے طریقے --- اسحٰق محمد ---- ۹

لکھنؤ میں اُردو ادب -- محمد حسن (ام۔اے) --- ۱۸

روس اور عورت -- سردار ہرچنس کور لدھیانوی --- ۲۶

داغ و امیر کے غیر مطبوعہ خطوط ---------- ۳۳

مالہ و ماعلیہ ---------- ۴۳

باب الاستفسار ---------- ۵۲

سورج کی آواز (نظم) -- اقبال سہیلی ---- ۵۴

رباعیات -- جگن ناتھ آزاد ---------- ۵۵

منظومات -- وحشت۔ کرم۔ شمیم۔ انجم۔ طرفہ۔ اختر --- ۵۶

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۸

ملاحظات

امریکہ کی خدائی حکومت

مسٹر ٹرومین، صدر امریکہ نے سینٹ لوئی کے ایک گرجا میں اپنی تقریر پیش کرتے ہوئے خود اپنے اور اہلِ امریکہ کے مذہبی جذبات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ بہت عجیب و غریب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ:

(۱) امریکہ انسانی احترام کا حامی ہے۔ (۲) خدا کے وجود کا قایل ہے۔ (۳) دُنیا میں امن و رواداری اور اخوت عامہ اس کا نصب العین ہے۔ (۴) اس کی تمام طاقت کی بنیاد روحانی ہے۔ (۵) وہ ملک کے ہر باشندے کو مساوی حقوق دینے کا پابند ہے۔ (۶) وہ ایسی رواداری، افادیت اور اخوت کا قایل ہے جو پیغمبروں کے اصول کے مطابق ہو۔

اگر واقعی صدر امریکہ کے الفاظ یہی ہیں اور امریکن حکومت در اصل ایسی ہی ہے تو دُنیا کو اپنی بے بصری و ناآگاہی پر ماتم کرنا چاہیئے کہ وہ اسوقت تک ایسی خدائی حکومت کو بالکل مادی حکومت سمجھتی رہی اور اسے ان تمام واقعات کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنا چاہیئے جو امریکہ کی اس خدا ترسی کے منافی اس وقت تک سننے میں آئے ہیں۔

وہاں کی سیاہ فام آبادی پر جو مظالم ہو رہے ہیں وہ بھی غالباً صرف روس کا پروپاگنڈا ہے، کوریا میں جن ہولناک مظالم کا اظہار اس کی طرف سے ہوا ہے، وہ بھی شاید افواہ سے زیادہ نہیں، ایشیا کے باشندوں کی آمد و رفت اور قیام امریکہ کے لئے جو پابندیاں وہاں ظاہر کی جاتی ہیں وہ بھی شاید اخباری جھوٹ ہے اور وہاں کے سرمایہ داروں نے طبقۂ عمال کو جس شکنجہ میں کس کر لاکھوں انسانوں کو بیروزگاری کی مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے وہ بھی غالباً محض داستاں سرائی ہے۔ امریکہ نے جو اربوں ڈالر کا سونا زیر زمین دفن کر رکھا ہے، اس کا مقصد بھی غالباً یہی ہوگا کہ وہاں کے عوام اس سے فائدہ اُٹھا کر فضول خرچی کی مذموم عادت نہ اختیار کر لیں اور وہاں سر بفلک مکانات بھی غالباً اسی مقصد سے تعمیر ہوئے ہیں کہ لوگ انھیں دیکھ کر خدا کی عظمت کے قایل ہوں۔

یقیناً اس سے زیادہ مساوات، اخوت انسانی اور عیسوی محبت و رافت اور کیا ہو سکتی ہے جو ہیروشیما میں ایٹم بم کے ذریعہ سے دُنیا پر ثابت کی گئی اور اس خدائی حکومت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے مارشل پلان ایسے مقدس ایثار کے ذریعہ سے تمام مغربی یورپ کو اپنے سامنے جھک جانے پر مجبور کیا۔

ٹرومین کا درسِ اشتراکیت

امریکہ کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ دُنیا میں کمیونزم کی اشاعت کو روکا جائے اور اس غرض کے لئے وہ اپنی فوجی قوت کو بڑھایا جا رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ چونکہ وہ اس سے بھی واقف ہے کہ کمیونزم انسان کے ذہن و اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے اور اسے قوت سے نہیں دبایا جا سکتا اس لئے اس نے درس اخلاق سے بھی کام لینا شروع کیا ہے۔ چنانچہ صدر امریکہ نے حال ہی میں ایک ایسے پروگرام کا بھی ذکر کیا ہے جو کمیونزم کے خلاف ان کے نزدیک بہت موثر ثابت ہوگا۔

انھوں نے فرمایا کہ انسداد کمیونزم کے لئے ضروری ہے کہ مزدوروں کو معقول اُجرت دی جائے اور کاروبار کے نفع میں ان کا بھی ایک حصہ مقرر کیا جائے۔ اس کے علاوہ مختصر پیمانہ پر تجارت کرنے والوں کو بھی ترقی کرنے کا موقعہ دینا چاہئے بوڑھے اور ناکارہ لوگوں کے لئے بھی وظایف مقرر ہونا چاہئے تاکہ وہ خیرات پر زندگی بسر نہ کریں۔ بیماری حادثات اور بیروزگاری کو بھی دور ہونا چاہئے، طبی امداد سب کو مفت ملنا چاہئے اور تعلیم کے مواقع بھی بلند و پست ہر خاندان کو یکساں حاصل ہونا چاہئے۔

اگر امریکہ واقعی اسی اصول کی پابندی کا حامی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کمیونزم کے خلاف ہے، کیونکہ کمیونزم بھی تو وہی چاہتی ہے جو ٹرومین نے ظاہر کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس پر عمل کی توفیق انھیں عطا نہیں ہوئی۔

کوریا، منچوریا اور تبت

جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی اور امریکہ کی فوجوں کو ہر جگہ ناکام ہونا پڑا، تو ہم نے ظاہر کیا تھا کہ جنگ کا موجودہ نقشہ قابل اعتبار نہیں اور برسات ختم ہونے کے بعد یلم سڑا شروع ہونے پر ہوا کا رخ پلٹنے کا قوی اندیشہ ہے، چنانچہ یہ اندیشہ پورا ہو کر رہا اور اب اتحادی افواج تقریباً پورے

شمالی کوریا پر قابض ہو چکی ہیں۔

ہم نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے امریکی فوجیں شمالی کوریا سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور منچوریا بھی اس آگ کی لپیٹ میں آجائے، چنانچہ حالات سے اس کی بھی تصدیق ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ روس نے شمالی کوریا کی شکست و تباہی کو کیونکر گوارا کر لیا، دوسرے یہ کہ اگر اتحادی افواج نے منچوریا کی طرف قدم بڑھائے تو روس و چین کا طرزِ عمل کیا ہوگا۔

ہم اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں کہ روس زرعی ملک ہے اور وہ از خود کبھی لڑائی کا جھگڑا مول نہ لیگا، اسلئے اگر شمالی کوریا کی ہمدردی میں وہ براہ راست کوئی عملی قدم اُٹھاتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ خود ایک فریق بن گیا ہے اور تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو جاتی۔

اس میں شک نہیں کہ شمالی کوریا کی اشتراکی حکومت روس ہی کے زیر اثر تھی اور اس کی حمایت روس کے لئے ضروری تھی، لیکن روس اچھی طرح جانتا تھا کہ سواحل چین، یا بحر پاسفک میں امریکن بلاک کے خلاف وہ مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتا ہے اور اشتراکیت و جمہوریت کے درمیان جو کشاکش جاری ہے اس کے امتحان کے لئے کوریا کی سرزمین مناسب نہیں۔ اس لئے وہ بھی اس تلخ گھونٹ کو خاموشی سے اُتار گیا اور چین کی کمیونسٹ حکومت بھی خاموش رہی کیونکہ اسے فارموسا میں اپنی بقا کے لئے ایک زبردست جنگ کرنا ہے اور وہ اس کی طیاریوں میں مصروف ہے۔

اب رہا سوال منچوریا کا، سو اس کی نوعیت البتہ مختلف ہے۔

پچھلی جنگ میں منچوریا پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا، لیکن جاپان کی شکست کے بعد ۱۹۴۵ء میں تین مشرقی صوبے چین کی قومی حکومت میں شامل کر دئے گئے اور مغربی علاقہ پر روس کا تسلط ہو گیا، لیکن ان دونوں حکومتوں میں ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کا دوستانہ معاہدہ ہو گیا، اس کے بعد جب چین میں کمیونسٹ حکومت قایم ہوئی اور روس نے اپنا علاقہ بھی چین کے سپرد کر دیا تو ۱۹۵۰ء میں ایک دوسرا معاہدہ یہ ہوا کہ حملہ کی صورت میں وہ ایک دوسرے کو فوجی مدد بھی دیں گے۔

منچوریا، چین اور روس دونوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ان میں سے کوئی اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اسپر جاپان یا کسی اور ایسی حکومت کا قبضہ ہو جائے جو اشتراکیت کی مخالف ہے۔ چنانچہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ منچوریا کی دفاع کے لئے چینی فوجوں کا اجتماع سرحد پر ہو رہا ہے، لیکن یہاں بھی روس کے لئے قریب قریب وہی دشواریاں ہیں جو کوریا کے محاظ پر اسکے سامنے آئیں، اور چین بھی فارموسا کا جھگڑا طے نہ ہونے کی وجہ سے پوری قوت کے ساتھ منچوریا کی مدافعت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انھیں صورتوں کے پیشِ نظر چین نے اس بساط پر ایک نئی چال چلی یعنی تبت کی طرف اپنی فوجیں بڑھانی شروع کر دیں۔ جس سے مقصود اتحادیوں کی توجہ کو منچوریا کی طرف سے ہٹا کر ایشیا کے اُس حصہ کی طرف مایل کرنا ہے جو باوجود اتحادیوں کی دسترس سے دور ہونے کے، بہت سی ایسی بین الاقوامی اُلجھنیں پیدا کر دینے والا ہے جن کو امریکن بلاک نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ابتک اس کا پتہ نہیں چلا کہ تبت پر چینی پیش قدمی کا ردِ عمل امریکن بلاک پر کیا ہوا، اور نہ جلد اس کی توقع کی جا سکتی ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا اثر منچوریا کے مسئلہ پر اچھا نہ پڑے گا اور ہو سکتا ہے کہ امریکن بلاک کو وہاں پیش قدمی کرنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آجائے۔

تبت اندرون ایشیا کا ایسا قطعۂ زمین ہے جو امریکن بلاک کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور اگر چین کا اس پر قبضہ ہو بھی جائے تو براہِ راست اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ امریکن بلاک فی الحال اس مسئلہ میں بالکل خاموش رہے، تاہم وہ اس موقعہ سے یہ فایدہ ضرور اُٹھائے گا کہ مجلس اقوام میں اشتراکی چین کی نمایندگی کا جو سوال پیش ہے، اسے التوا میں ڈال دے اور چین کی حمایت کرنے والوں کا منہ بند کر دے جن میں سے ایک ہندوستان بھی ہے — ہندوستان سے البتہ تبت کا براہِ راست تعلق ہے کیونکہ اگر تبت پر چین کا قبضہ ہو گیا تو پھر ہندوستان و چین کے درمیان کوئی حد فاصل باقی نہ رہے گی اور دونوں کی سرحد مل جائے گی۔

گو سرحدوں کا مل جانا کوئی ایسی بات نہیں جس سے کم از کم ہندوستان کو کوئی فکر لاحق ہو لیکن اس خیال سے کہ روس کو فوجی مرکز قایم کرنے کی ایک اور جگہ مل جائے گی، امریکن بلاک کو ضرور تشویش پیدا ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کا ردِ عمل کشمیر کے مسئلہ پر بھی اثر انداز ہو — تبت پر اگر چین قابض ہو گیا تو امریکن بلاک کو یقیناً فکر ہو گی کہ وہ اس کے جواب میں اس سے قریب تر کسی جگہ اپنا فوجی مرکز بھی قایم کریں اور ایسی جگہ کشمیر سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی۔ مجلس اقوام کا اس وقت تک کشمیر کے مسئلہ کو جھلائے رکھنا اور کوئی فیصلہ نہ کرنا صرف اسی لئے تھا کہ اس کے سامنے نہ سوال پاکستان کا ہے نہ ہندوستان کا بلکہ صرف اس بات کا کہ اشتراکیت کے خلاف اسے ایک کمین گاہ بنانے کے لئے ہندوستان و پاکستان میں سے کس کے ساتھ سودا کرنا مناسب ہو گا یا دونوں کو محروم کر کے خود اپنا تسلط قایم کرنا ضروری قرار پائے گا اور ہو سکتا ہے کہ تبت کا مسئلہ انھیں اس بات کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دے۔

پاکستان کے خریداروں سے

پاکستان کے ان خریداروں کے نام جن کا چندہ ختم ہو گیا تھا اور ابتک وصول نہیں ہوا یا جن کی خریداری دسمبر میں ختم ہوتی ہے ان کے نام دسمبر تک نگار بدستور جاری رہے گا۔ لیکن سالنامہ اسی وقت روانہ ہو گا جب ان کا چندہ چھ روپیہ (پاکستانی سکہ) کراچی ہمارے نمایندہ کے پاس پہونچ جائے گا۔ منیجر نگار

سالنامہ ۱۹۵۱ء کے لئے

چار آنے کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے بھیجدیجئے۔ ورنہ اس کے ضایع ہونے کے ذمہ دار ہم نہ ہوں گے۔ منیجر

اظہار اعداد کے طریقے

(یہ سلسلۂ ماسبق)

مروجہ ہندسوں کی ایجاد

عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مروجہ ہندسوں کے موجد ہندو تھے یعنی ہندوؤں سے ہندسے لکھنا عربوں نے سیکھا اور عربوں سے یورپ والوں نے۔ اسی لئے اہلِ عرب علامات شمار کو "ارقامِ ہندی" اور اہلِ یورپ "عربک فیگرز" (ARABIC FIGURES) کہتے ہیں۔ ان میں سے آخری خیال پر علماء کو کامل اتفاق ہے لیکن پہلا خیال یعنی اعداد کا لکھنا ہندوؤں سے عربوں نے سیکھا وقتاً فوقتاً زیرِ بحث آتا رہا ہے۔ چنانچہ ببنو (BABNAV) اور کے ای (KAYE) مروجہ ہندسوں کا موجد ہندوؤں کو نہیں مانتے۔ بہرحال اتنا یقینی ہے کہ مروجہ ہندسے صرف دو قوموں کے ملاپ کا نتیجہ ہیں یعنی اہلِ ہند اور اہلِ عرب۔ اسی لئے مروجہ ہندسوں کو "ہندو عربی" (HINDU ARABIC) کا نام دیا جاتا ہے اور ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کی ایجاد میں ان دو اقوام کا کتنا کتنا حصہ ہے۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مروجہ ہندسوں کی خصوصیت ایک سے لیکر نو تک کے اعداد کے لئے علٰحدہ علٰحدہ نشانات، صفر کا نشان اور اکائی دہائی والا حساب کا طریقہ ہے۔ جیسے اس میں ۲۲۲۲ پہلا دو اکائی کی جگہ، دوسرا دہائی کی جگہ تیسرا سیکڑے اور چوتھا ہزار کی جگہ ہے۔ کہتے ہیں حساب کے اس طریقہ کا تعلق آلۂ شمار سے ہے۔ لہٰذا آگے چلنے سے پہلے ہم اسی آلہ پر غور کریں۔

آلۂ شمار[1] آپ نے مدرسوں میں ایک قسم کا چوکٹھا دیکھا ہوگا جس میں کھڑے یا آڑے تار لگے ہوتے ہیں اور ان تاروں میں چھوٹی چھوٹی گولیاں پروئی ہوتی ہیں پہلے تار کی گولیاں اکائیاں ظاہر کرتی، دوسرے کی دہائیاں، تیسرے کی سیکڑے اور چوتھے کی ہزار۔ وقس علیٰ ہذا۔

یہ آلہ "بال فریم" (BALL ERAME) کہلاتا ہے اور بچوں کو ابتدائی حساب سکھانے کے کام میں لایا جاتا اس کی سادہ بناوٹ اس قسم کی ہوتی ہے:-

---

[1] Encyclopedia Britanica (14th ed.) article on "Abacus"

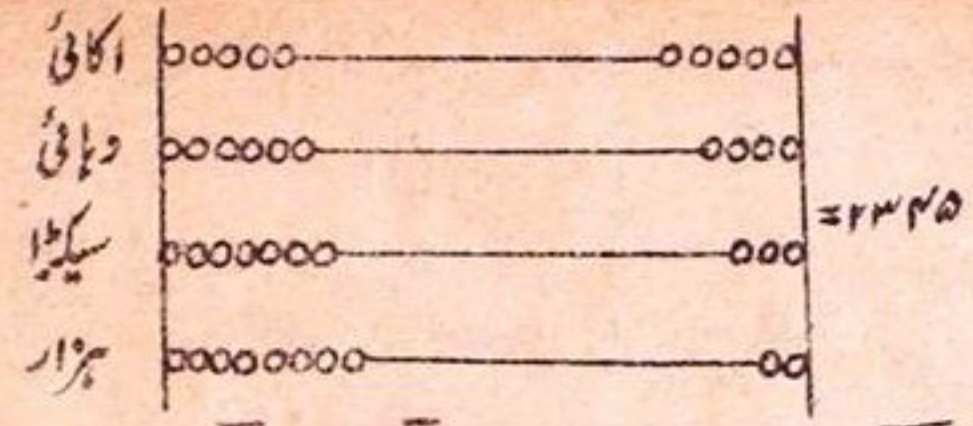

چین میں یہی آلہ سُوآن پان (SUAN PAN) اور جاپان میں سوروبان (SOROBAN) کہلاتا ہے۔ روس میں بھی اسے کام میں لاتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں اس کا چلن نہایت ہی عام تھا لیکن اُس وقت اس کی صورت کچھ مختلف تھی۔ یعنی ایک تختہ پر اکائی، دہائی، سیکڑے اور ہزار وغیرہ کے لئے لکیریں کھینچ لی جاتی تھیں اور اُن پر پانسے رکھ کر حساب کرتے تھے۔ پہلے یہ لکیریں عمودی ہوتی تھیں لیکن بعد میں اُفقی طور پر کھینچنے لگے اور اُن لکیروں کے درمیان پانچ، پچاس، پانچسو اور پانچ ہزار وغیرہ کی جگہ بھی متعین کی گئی۔ شاید ان تصاویر سے ہمارا مطلب اچھی طرح واضح ہو سکے

جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ یہی صورت سب سے قدیم ہے۔ ماضی بعید میں کنکریوں کے ذریعہ حساب کرنے کا رواج تھا اور چونکہ ہزار، دس ہزار کنکڑیوں کا رکھنا دقتوں سے خالی نہ تھا۔ اس لئے ہر کنکری کی ایک قیمت مقرر کی گئی۔ اس طرح جس شخص کے پاس پچاس کنکریاں ہوتیں وہ دس ہزار تک اعداد کا حساب کر سکتا تھا۔

حسابُ الغبار

اس کے بعد ایک دوسرے قسم کے حسابی طریقہ پر آیئے۔ عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ عربی کی جس قسم سے یوروپین ہندسوں کا ماخوذ ہونا ثابت ہے اُنھیں اہلِ عرب "غباری ہندسے" کہتے تھے۔ اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھیں کسی تختہ پر بالو یا مٹی بچھا کر لکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ پانسے والے حساب سے اس بات میں مختلف تھا کہ لکیروں کی قیمت اکائی، دہائی کے لحاظ سے مقرر نہ تھی بلکہ اُن کے درمیانی جگہوں کی اور لکیروں پر پانسے نہ رکھے جاتے

تھے بلکہ لکیروں کے درمیان نشانات بنائے جاتے تھے جنھیں "حروف الغبار" یا "غباری ہندسے" کہتے تھے۔ اس طریقہ پر اہلِ عرب نے کئی کتابیں لکھی تھیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں :-

نام مصنف	نام کتاب
(۱) علی ابن احمد ابوالقاسم الانطاکی المجتبیٰ	(۱) کتاب التخت الکبیر فی الحساب الہندی
〃 (متوفی ۹۸۷ء)	(۲) کتاب فی الحساب علی التخت بلا محوٍ
〃	(۳) کتاب الحساب بلا تخت بل بالید
(۲) محمد ابن عبداللہ ابونصر الکلوذانی (معاصر الانطاکی)	(۴) کتاب التخت فی الحساب الہندی
(۳) سنان ابن الفتح (متوفی ۹۴۱ء)	(۵) علم حساب التخت (؟)
(۴) یعقوب بن محمد الرازی	(۶) کتاب التخت
(۵) امین الدین الاجری (متوفی ۱۳۳۲ء)	(۷) کافیتہ فی حساب التخت والمیل
(۶) ابوعبداللہ الزناتی	(۸) جوامع الحساب بالتخت والتراب

ان کتابوں کا ذکر پروفیسر ڈیوڈ یوجین اسمتھ (ٹیچرس کالج، کولمبیا یونیورسٹی) اور صالح مراد (رابرٹ کالج قسطنطنیہ) نے اپنے مشترکہ مضمون مطبوعہ "امریکن میتھمیٹیکل منتھلی" میں کیا ہے[۱]۔ اس انقلاب آفریں مضمون کی اشاعت سے پہلے عام خیال یہ تھا کہ عربی لیٹریچر میں کسی قسم کے آلۂ شمار کا ذکر نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ابن ندیم کی فہرست، ابن القفطی کی تاریخ الحکماء اور دوسری عربی کتابوں میں "کتاب التخت" کو "کتاب التخت" لکھا ہے جس سے کوئی مطلب پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن محض ایک نقطہ کے اضافہ سے (جو کسی طرح چھوٹ گیا تھا) ان کی اصلیت عیاں ہو گئی۔ "کتاب التخت"، "حساب التخت والمیل" ان سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً اہلِ عرب میں حساب کی صورت یہ تھی کہ پہلے وہ کسی تختہ پر مٹی بچھا لیتے۔ پھر اُس پر سلائی وغیرہ کے ذریعہ جدولیں کھینچ کر اعداد لکھتے تھے۔

مضمونِ مذکورہ کی اشاعت کے بعد سٹر سالومن گینڈز[۲] (نیویارک) اور بیجوتی بھوشن دت[۳] (کلکتہ یونیورسٹی) نے

---

[۱] American mathematical Monthly vol. 34 May 1927 "The Dust Numerals" Among the Ancient Arabs - David Eugene Smith + Salih Murad.

[۲] American mathematical Monthly vol 34 July 1927 "Did the Arabs knew the Abacus" — Solomon Gandz.

[۳] American Mathematical vol 35 Dec. 1928 "The Science of Calculation of the Board" — Bibhutibhushan Datt.

اس طرف توجہ کی۔ آخر الذکر نے اپنے مضمون میں یہ لکھا ہے کہ تختہ پر خاک بچھا کر حساب کرنے کا رواج ہندِ قدیم میں بھی تھا اور آج بھی بنگال کے نجومی اس طرح حساب کرتے ہیں۔ حساب کے اس عمل کو "دھول کرمی" کہا جاتا تھا۔ اسی کا ترجمہ اہل عرب نے "حساب الغبار" کیا۔ حساب کو "گنت" اور تختہ یا تختی کو "پٹ" یا "پٹی" کہتے تھے۔ اسی لئے حساب کے اس مخصوص طریقہ کو "پٹی گنت" کہتے تھے جس کا ترجمہ اہلِ عرب نے "حساب التخت" کیا۔ "کتاب التخت" ترجمہ ہے "پٹی شاستر" کا اور چونکہ حساب کا یہ طریقہ ہندوستان سے ماخوذ تھا۔ اسی لئے اہلِ عرب اُسے "حساب الہندی" کہتے تھے۔

غباری ہندسے

اس کے بعد اُن نشانات پر آیئے جو اکائی، دہائی کی جدولوں کے بیچ میں لکھے جاتے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے بیچ میں لکھنے کے لئے اگر زمانۂ قدیم کے ہندسے کام میں لائے جاتے تو پہلے نو اعداد کے سوا بقیہ کی اہمیت زایل ہو جاتی۔ مثلاً روٹن میں ایک، دو، تین، چار، پانچ، دس، بچاس، سو، پانچسو، اور ہزار کے لئے علٰحدہ علٰحدہ نشانات تھے مگر جدولوں میں لکھنے کے لئے پہلے نو ہندسے کافی ہوئے جیسے[۵]:-

سیکڑا	دہائی	اکائی	
۷۱	۷	۱۷	= ۶۵۴
۷۱	۷		= ۶۵۰
	۷	۱۷	= ۵۴

اب اگر ہم یہ مان لیں کہ ہندوستان میں اکائی، دہائی کی لکیروں کے بیچ میں علامات لکھنے کا رواج تھا تو یقیناً یہ علامات ہندِ قدیم کے براہمی ہندسوں سے ماخوذ ہوں گی جو یہ ہیں:-

۱— ۱ — —
۲— ۱۱ = =
۳— ۱۱۱ ≡ ≡
۴— + ५ ५
۵— ∓ ∓ ५ ५
۶— ६ ६ ६ ६
۷— ७ ७ ७
۸— ८ ८
۹— ९ ९ ९

ان میں سے وہ اشکال جو مروجہ ہندسوں کا ماخذ ہو سکتی ہیں مع یورپین، ناگری اور عربی ہندسوں کے ارتقاء کے یہ ہیں:-

---

[۵] Chambers Encyclopaedia - article on "Numerals"

۹ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱	ہندِ قدیم کی علامتیں
۹ × ۷ 6 5 4 3 2 1	یورپین ہندسوں کا ارتقاء
۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲	ناگری ہندسوں کا ارتقاء
۹ × ۷ × × ۴ ۳ ۲ ۱	عربی ہندسوں کا ارتقاء

ان میں سے چار، پانچ اور نو کے نشانات کے بارے میں کچھ اُمور کو یاد دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ چار اور پانچ کے نشانات آپس میں بدل گئے ہیں۔ عام طور سے انھیں ۴ ۴ ۴ چار کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، لیکن واقعتاً یہ پانچ ہیں اور چار اور ایک کے نشانات کو ملانے سے بنے ہیں۔ اسی طرح اس نشان کو ۵ پانچ مانا جاتا تھا لیکن واقعتاً یہ چار ہے۔ نو کا یہ نشان ۹ دس ۹ سے ماخوذ ہے جو نو اور ایک کو ملانے سے بنا ہے یہ نظریہ انگریزی کے آٹھ، ناگری کے ایک، عربی کے چار، پانچ، چھ اور آٹھ کی تشریح کرنے سے معذور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بعد کی مقامی ایجادیں ہیں۔ اس امر کی تفصیل ہم آیندہ کریں گے۔

صفر کی ایجاد

صفر کی ایجاد کیسے ہوئی اس بات کو سمجھانے کے لئے میں رومن اعداد والی گزشتہ جدول کو پھر نقل کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں:۔

سیکڑا	دہائی	اکائی	
۷۱	۷	۱۷	۶۵۴
۷۱	۷		۶۵۰
	۷	۱۷	۶۴

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ "شماری جدول" کی ایجاد سے رومن کے پہلے نو اعداد کو چھوڑ کر بقیہ کی اہمیت زایل ہوگئی۔ اب دس، پچاس، سو، پانچ سو وغیرہ کے لئے علٰحدہ نشانات کی کوئی ضرورت نہیں رہی مگر رومن ہندسوں اور شماری جدول کو جوڑ کچھ اچھا نہیں رومن کے پہلے نو ہندسے مرکب ہیں مثلاً چھ کا نشان پانچ اور ایک کو ملانے سے بنا ہے، چار کا نشان پانچ کے نشان میں سے ایک نکالنے سے۔ ان "مرکب اعداد" کا نتیجہ یہ ہے کہ کالم کو اُڑایا نہیں جا سکتا۔ اگر ہر ہندسے کے لئے ایک علٰحدہ شکل ہوتی تو کالم بنانے کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اپنے بیان کی وضاحت کے لئے میں اوپر دئے ہوئے کالموں میں عربی اعداد لکھتا ہوں:۔

سیکڑا	دہائی	اکائی
۶	۵	۴
۶	۵	
	۵	۴

مندرجہ بالا اعداد کو اگر بغیر کالم کے لکھا جائے تو سب سے اوپر والے اور سب سے نیچے والے خانوں میں کوئی دقت نہیں گڑبڑی صرف بیچ کے خانوں میں پیدا ہوتی ہے جس کا باعث ایک خانہ کا خالی رہنا ہے۔ اس خلا کو سب سے پہلے ہندوؤں نے محسوس کیا اور اس نشان سے ظاہر کیا "○" جو خلے، خول، کھول اور کھُلے پن کی تصویر ہے جیسا کہ اس نقش سے ظاہر ہے:- ● خلے کو اہلِ ہنود "شونیہ" کہتے ہیں۔ اسی کا ترجمہ اہلِ عرب نے "صفر" کیا۔ صفر کی ایجاد سے شماری جدول بنانے کی ضرورت نہیں رہی۔

اشکالِ ہندسہ کی ایجاد

پس اس بحث سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ ہندسوں کی اشکال اور اکائی، دہائی والا حساب کا طریقہ دونوں ہندوؤں کی ایجاد ہیں لیکن اس نتیجہ کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ مروجہ ہندسوں میں کام آنے والی شکلوں کے بارے میں کچھ اور بھی نظرئے ہیں اور جب تک اُنکی باقاعدہ تردید نہ کر دی جائے دعویٰ مذکورہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اظہارِ اعداد کے لئے انسان نے اب تک جتنے طریقے اختیار کئے ہیں اگر آپ اُن پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ تین منازل کو ظاہر کرتے ہیں (۱) تصویری دور (۲) علامتی دور (۳) حروفی دور۔ پہلے دور کی خصوصیت یہ تھی کہ جس عدد کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا اُس کے لئے اُتنی ہی لکیریں کھینچ دیتے جنہیں گن کر ہر شخص یہ معلوم کر سکتا کہ کس عدد کو ظاہر کیا گیا ہے برخلاف اس کے علامتی دور میں جن نشانات کو کام میں لایا جاتا تھا اُن کا مطلب خود ظاہر نہ ہوتا بلکہ سیکھنا اور سمجھنا پڑتا۔ حروف سے اعداد کے اظہار کی چار صورتیں ہیں یعنی (الف) لفظوں میں عدد لکھنا (ب) بجائے پورا نام لکھنے کے اُس کا پہلا حرف لکھنا (ج) ہر حرف سے ترتیب وار ایک عدد کا ظاہر کرنا (د) پہلے نو حروف سے اکائیاں، دوسرے نو سے دہائیاں اور تیسرے نو سے سیکڑے ظاہر کرنا۔ مروجہ ہندسوں کی ایجاد کے بارے میں جتنے نظرئے پیش کئے گئے ہیں وہ ان تین دوروں سے متعلق ہیں یعنی ا-

برٹش انسائیکلوپیڈیا کا خلاصہ [۵۶]

پرانے زمانہ میں اظہارِ اعداد کی ایک صورت یہ تھی کہ جس عدد کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا اُتنی ہی لکیریں کھینچ دیتے۔ برٹش انسائیکلوپیڈیا میں جس شخص نے اعداد (NUMERALS) پر مضمون لکھا ہے اُس کا کہنا ہے کہ ایک سے نو تک کے اعداد کے لئے جو نشانات ہیں وہ اتنی ہی لکیروں کو مختلف طرح سے ترتیب دینے اور اُن کو جلدی لکھنے سے بنے ہیں (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ا الف) ان میں ایک سے تین تک کے مروجہ ہندسوں کے بننے کی صورت وہی ہے جو براہمی ہندسوں سے مروجہ ہندسوں کے ارتقاء کی تحت ظاہر کی گئی ہے۔ لیکن انگریزی چار بننے کی جو صورت ظاہر کی گئی ہے اُس پر براہمی والے نظریہ کو ترجیح دیجائے گی۔ یعنی

---

۵۶ Students British Ency. of Universal knowledge (Lond: 1899)

یہ نشان ✚ عدد چار کا مظہر ہے اور جب اسے جلدی لکھا تو یہ شکل 4 بن گئی۔

یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز ہے کہ پانچ اور چھ کے ہندسے واقعتاً پانچ اور چھ لکیروں سے مرکب معلوم ہوتے ہیں اور آٹھ بننے کی جو صورت ظاہر کی گئی ہے وہ یقیناً قابلِ قبول ہے یعنی وہ دو چوکور شکلوں کو ملانے سے بنا ہے۔ براہمی والا نظریہ انگریزی آٹھ کی تشریح کرنے سے معذور ہے۔

نو کا ارتقاء جس طرح ظاہر کیا گیا ہے وہ معقول معلوم پڑتا ہے لیکن سات کا بننا یکسر غلط ہے۔

ویدک سمپتی[۵] کے مصنف کی رائے

پنڈت رگھونندن شرما نے ناگری ہندسوں کے ارتقاء کی بالکل وہی صورت ظاہر کی ہے جو برٹش انسائیکلو پیڈیا میں انگریزی ہندسوں کی ظاہر کی گئی ہے (نقشہ نمبر ا۔ ب) دو اور تین کا بننا تو اسی طرح ظاہر کیا گیا ہے جیسے براہمی والے نظریے میں پانچ اور چھ کے ناگری ہندسے یقیناً پانچ اور چھ لکیروں سے مرکب معلوم پڑتے ہیں۔ سات، آٹھ اور نو کا ارتقاء نہایت ہی پیچیدہ اور ناقابلِ قبول ہے۔ ایک کے دائیں طرف صفر کا ہونا بھی ناقابلِ فہم ہے اور چونکہ یہ اشکال کسی بھی کتبہ میں نہیں پائی جاتیں لہٰذا اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں نظریے ناقابلِ قبول ہیں، البتہ برٹش انسائیکلو پیڈیا میں ہمارے مطلب کا یہ اشارہ ضرور ہے کہ انگریزی آٹھ کا تعلق براہمی ہندسے سے نہیں ہے۔ وہ مقامی ایجاد ہے اور دو چوکور شکلوں کی نوک کی نوک ملانے سے بنا ہے۔

مسٹر ماتھر کا نظریہ

منشی رام پرشاد ماتھر بی۔ اے (علیگ) نے "نئی تعلیم کا آئینہ"[۵] ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں علم الحساب سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے یعنی "ہندی ہندسے درحقیقت انگلیوں کی تصویریں ہیں۔ اگر آپ اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی کو اس طرح سامنے لاویں کہ گھنی اٹھی رہے اور انگوٹھا پورا کھلا ہوا تو معلوم ہوگا کہ مٹھی کی مڑی ہوئی انگلی اور انگوٹھا ملکر ایک کا ہندسہ بناتی ہیں (نقشہ نمبر ا۔ ج) اس کے بعد اگر آپ انگوٹھے کے پاس والی انگلی بھی کھول دیں تو کھلا ہوا انگوٹھا اور کھلی انگلی مل کر دو کی صورت ظاہر کریں گے۔ پھر اس کے پاس کی ایک انگلی بھی کھول کر پہلی انگلی موڑ دیجئے تین کا ہندسہ بن جاویگا۔ اسکے بعد ایک انگلی اور کھول دیجئے اور پہلی انگلی اور انگوٹھے کے سر کو ملا کر دو کھلی انگلیوں پر جھکا دیجئے تو چار کا ہندسہ بن جائے گا۔ اور تمام پنجے کو اس طرح کھول دینے پر کہ دو دو انگلیاں علٰحدہ مل جاویں اور جھکا ہوا انگوٹھا ہتھیلی سے الگ ملے پانچ کا

---

[۵] प० रघुनन्दन शर्मा ..... वैदिक सम्पत्ति

[۵] مرحوم متعدد اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ آپ سے کئی کتابیں یادگار ہیں مثلاً ابتدائی تعلیم کی رام کہانی۔ ہندو تیوہاروں کی اصلیت وغیرہ۔ یہ کتابیں مسٹر رگھونندن پرشاد ماتھر (ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی) سے مل سکتی ہیں۔ آپ کا پتہ یہ ہے:۔ ۱۶ سروجنی دیبی لین لکھنؤ۔

ہندسہ بن جاوے گا۔ اس صورت میں ہتھیلی کی پشت آپ کے سامنے ہونی چاہئے پھر دائیں ہاتھ کی مٹھی کے انگوٹھے پر بائیں ہاتھ کی مٹھی کا انگوٹھا لگانے سے چھ کا ہندسہ بنے گا۔ بائیں ہاتھ کے مڑے ہوئے انگوٹھے اور کھلی ہوئی پہلی انگلی سے سات کا ہندسہ بن جاتا ہے۔ اور بائیں ہاتھ کی دو کھلی لیکن باہم ملی ہوئی انگلیاں اور پورے کھلے ہوئے انگوٹھے سے آٹھ کا ہندسہ بنتا ہے۔ اسی حالت میں تیسری انگلی کو بھی کسی قدر کھولنے کی کوشش کیجئے تو نو کا ہندسہ بن سکتا ہے اور دائیں ہاتھ کے ایک ہندسہ پر بائیں ہاتھ کی بندھی ہوئی مٹھی کلائی کے برابر رکھنے سے دس کا ہندسہ ہو جاتا ہے۔ رومن لوگوں نے ان ہندسوں کی ترکیب کھلی ہوئی انگلیوں سے کی تھی اور اس وجہ سے ان کے ہندسوں کی صورت کھڑی انگلیوں، کھلے پنجے اور ہاتھ پر رکھے ہوئے ہاتھ سے ملتی ہیں۔"

اس نظریہ کا شمار "علامات" کی تحت کیا جائے گا۔ ماتھر صاحب سے پہلے ناگری ہندسوں کی اس اصلیت کا علم کسی کو نہ تھا۔ آپ نے بتایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ناگری ہندسے انگلیوں کی تصویریں ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ پرانے زمانہ میں انگلیوں سے اعداد کا اظہار کیا جاتا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ رومن کے پہلے چار ہندسے I II III IIII انگلیوں کی تصویریں ہیں۔ پانچ کا نشان V انگوٹھے کے پاس والی گھائی کی تصویر ہے اور دس کا نشان X بعض حضرات کے نزدیک دو پانچ کے نشانات کو ملانے سے بنا ہے X اور بعض کے نزدیک تلے اوپر رکھے ہوئے ہاتھوں کی تصویر ہے ہر ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں، لہٰذا دس کو دو ہاتھ کہنے کی بناء پر ایک ہاتھ کے اوپر دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ مگر ناگری ہندسوں کا موجودہ صورت سے پایا جانا نویں صدی بلکہ کچھ اس کے بعد کی چیز ہے۔ اس سے پہلے ان کا وجود نہ تھا اور اس وقت ہندوستان میں فنِ تحریر کا عام رواج تھا لہٰذا اگر ناگری ہندسے اُس نمونے سے بنائے گئے ہوتے جیسا کہ ماتھر صاحب نے بتایا ہے تو ضرور یہاں کے لٹریچر میں اس کا ذکر ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ پھر صفر کی ایجاد کا جو طریقہ انھوں نے بتایا ہے (یعنی وہ بندھی ہوئی مٹھی میں انگوٹھے اور پہلی انگلی کے درمیان کا خلا ہے) وہ نہایت ہی مہمل ہے۔ صفر کی ایجاد یقیناً آلۂ شمار سے متعلق ہے۔ بر ایں بنا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ناگری ہندسے انگلیوں سے نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ماتھر صاحب نے انگلیوں کو ناگری ہندسوں کی وضع کا بنا کر دکھایا ہے اور یہ نظریہ "رومن ہندسوں کا ماخذ انسانی ہاتھ ہے"۔ والے نظریے سے متاثر ہو کر گڑھا گیا تھا۔

(باقی) اسحٰق محمد

نگار کے پرانے فائل

۳۹ء۔ ۴۲ء۔ ۴۳ء۔ ۴۴ء۔ ۴۶ء۔ ۴۷ء اور ۴۸ء کے مکمل۔ قیمت فی مکمل فائل معہ محصول دس روپیہ۔ جولائی تا دسمبر ۳۲ء۔ قیمت معہ محصول پانچ روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

نقشہ نمبر ۱

(الف)

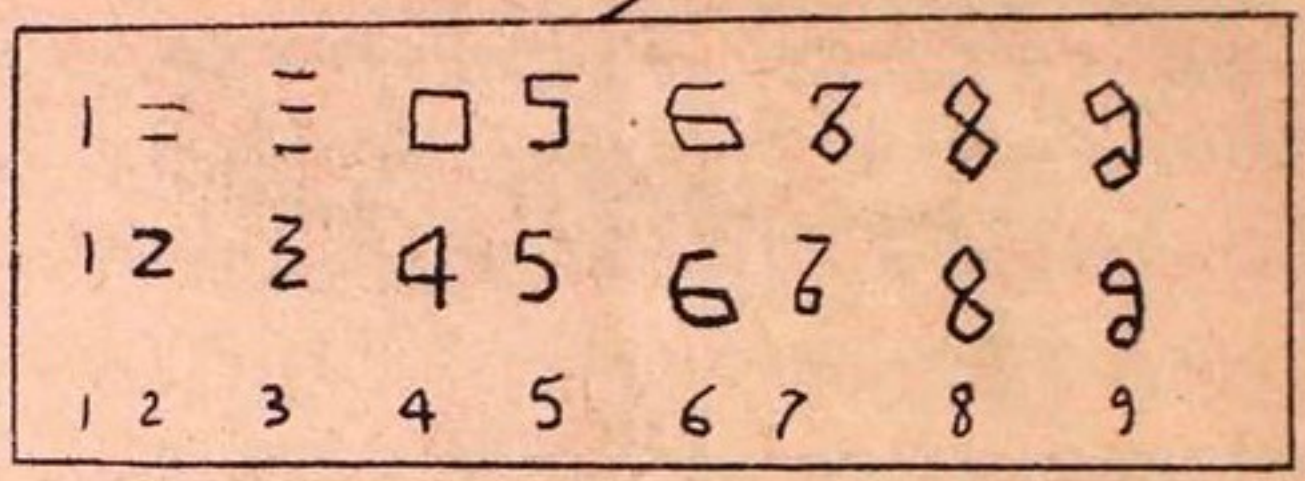

(ب)

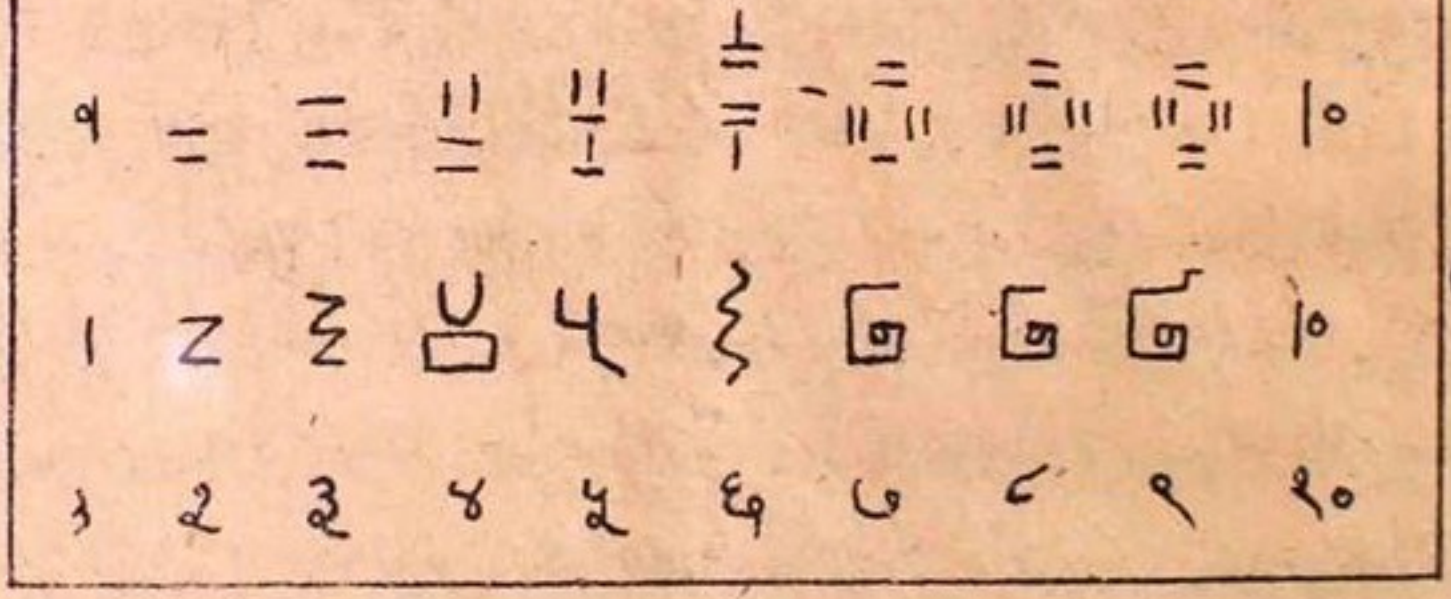

(ج)

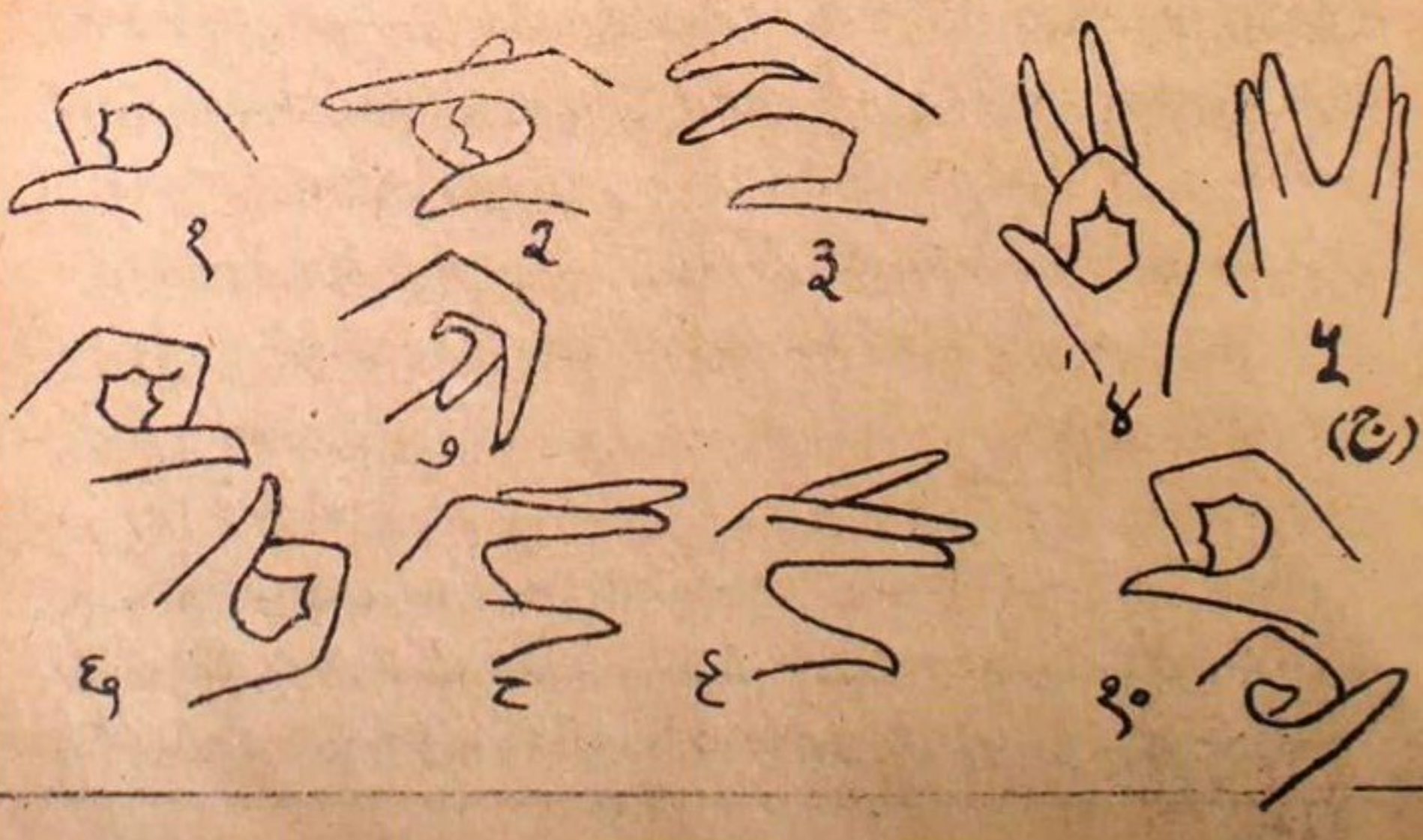

لکھنؤ میں اُردو ادب

(بہ سلسلۂ ماسبق)

لکھنؤ میں اُردو شاعری کا تیسرا دور

اس عرصہ میں دہلی کی مرکزی طاقت اپنی رہی سہی آن بان بھی کھو چکی تھی۔ احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے زیر اثر شاہ عالم کا اقتدار ختم ہو چکا تھا اور غلام قادر روہیلہ نے جب شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی تو دہلی سے اقتدار کے ساتھ ساتھ رعب و اقبال بھی رخصت ہو گئے۔

اودھ میں نواب سعادت علی خاں کی خوش انتظامی اور تدبر کا زمانہ کمپنی کی مداخلت کی بنا پر عارضی ثابت ہوا اور غازی الدین حیدر کے تخت نشین ہوتے ہی وہ احتیاط اور سوجھ بوجھ بھی ختم ہو گئی۔ کمپنی نے اودھ پر اپنا شکنجہ اور مضبوط کر دیا۔ اس عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ کمپنی نے دہلی دربار کی مرکزیت کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور رہا سہا سیاسی اقتدار بھی ختم کرنا چاہا اس سلسلہ میں سب سے بڑی ضرب یہ لگائی کہ نواب غازی الدین حیدر کو جو اب تک اپنے کو نواب کہتے تھے اور دربار دہلی کی ماتحتی اور فرمانبرداری کا دم بھرتے تھے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ خود مختاری کا اعلان کر کے 'شاہ' کا لقب اختیار کریں۔ جب سیاسی طاقت اور اقتدار کے واپس آنے کی امید نہ ہو تو ظاہری شان و شکوہ اور کاغذی خطابات بھی غنیمت نظر آنے لگتے ہیں چنانچہ نواب غازی الدین حیدر نے شاہ کا لقب اختیار کیا اور دربار دہلی کی ماتحتی کی بجائے خود مختاری کا اعلان کیا۔

خود مختاری کا یہ اعلان محض ایک سیاسی حادثہ نہ تھا۔ دہلی کی مرکزیت کا خاتمہ اور مغل سلطنت کا زوال قریب تھا غازی الدین حیدر کے زمانہ تک ایک طرف دہلی کا زوال اس حد تک پہونچ چکا تھا کہ اس کے عروج کے دن دیکھنے والے اس اُجڑی ہوئی حالت میں دہلی کو پہچان نہ سکتے تھے دوسری طرف اُردو شاعری کا پودا جو دہلی سے آیا تھا اور جس کی آبیاری میں دہلی والوں کا معتد بہ حصہ رہا اب لکھنؤ کی سرزمین میں جڑ پکڑ چکا تھا اور سرسبز ہو رہا تھا اور اس طرح تہذیبی حیثیت سے لکھنؤ نے اپنا ایک معیار اور امتیازی خصوصیت قایم کر لی تھی، چنانچہ سیاسی خود مختاری کے ساتھ ہی ساتھ اودھ کی تہذیبی اور خصوصاً ادبی خود مختاری کا دور شروع ہوتا ہے اس طرح ایک سلسلہ ختم ہوتا ہے جو دہلی سے چلا لکھنؤ جسے میر اور سودا نے دہلی کا پروردہ کہا اور انشاء نے دہلی کی جان بتایا، ناسخ کے عہد میں اس نے اپنے کمال

ہونے کا اعلان اور خود مختاری کا دعویٰ کیا۔

شاعری میں یہ خود مختاری ایک نئے رنگ سے چمکی اور یہی رنگ لکھنؤ کے نام سے وابستہ ہو کر یہاں کے دبستانِ شاعری کا رنگ امتیاز بنا۔ یہ نیا رنگ کیا تھا اور اس پر کون کون سے تاریخی اور سماجی اثرات مرتسم ہوئے؟

جس طرح نواب غازی الدین حیدر[1] کے شاہ ہو جانے سے اودھ کی سیاسی اہمیت اور نظم و نسق میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آئی یا کوئی نیا دور شروع نہیں ہوا بالکل اسی طرح لکھنؤ کا دبستانِ شاعری بھی کسی ایک مخصوص شاعر یا لمحے سے متعلق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، لکھنؤ کی سماجی حالت اور سکون اور اطمینان نے سوداؔ اور ان کے بعد آنے والے شعرا کو ماورائی تصوف اور درد و گداز کی بجائے ارضیت اور نشاط کی طرف رجوع کیا تھا جس نے:۔

(۱) حسرتؔ اور جرأتؔ کے زمانہ میں معاملہ بندی اور مادی عشق کی مختلف شکلیں اختیار کیں۔

(۲) سوز و گداز اور جذباتی خلوص سے زیادہ لوگوں کو شوخی۔ رندی اور بیان کی چاشنی کی طرف راغب کیا اور۔

(۳) الفاظ کی ماہیت، طرزِ بیان کی قوت، اور زبان کی قدر و قیمت کی طرف مایل کیا۔

یہ تمام رجحانات جو مختلف راہوں سے ہوتے ہوئے آئے تھے اور سوداؔ سے لے کر انشاؔ تک کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے تھے ناسخؔ کے عہد میں زیادہ واضح صورت میں ڈھلتے ہیں اور دراصل یہی رجحانات ایک قطعیت اور امتیازی شان حاصل کر لیتے ہیں اور بالآخر لکھنؤ کا طرزِ سخن قرار پاتے ہیں۔

اس دور میں ہمیں خصوصیت کے ساتھ دو مسایل پر غور کرنا ہے ایک قصیدہ کا فقدان اور دوسرا مرثیے کا عروج ان کی مفصل وجوہ تو اپنے موقع پر آئیں گے لیکن مختصراً یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس دور میں مرثیہ عروج پکڑتا ہے اور قصیدہ اُردو شاعری میں اس کے لئے جگہ چھوڑتا ہے۔ اودھ کے بادشاہوں کو اپنی سلطنت کے روبہ زوال ہونے، اپنی مجبوری اور بے چارگی اور کمپنی کے اقتدار و طاقت کا پورا پورا احساس تھا اور وہ خواب میں بھی سیاسی طاقت کا خیال نہ کرتے تھے صاحب تاریخ اودھ نے لکھا ہے کہ نواب غازی الدین حیدر ارباب نشاط اور اپنے متوسلین سے کہا کرتے تھے جب تک میں زندہ ہوں جتنا تمھاری قسمت میں ہے لے لو جتنا سمیٹ سکو سمیٹ لو۔ میرے بعد روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور ایک قطرہ پانی کے لئے ترسو گے؛ ایسے میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنی دلیری اور عدل و انصاف کی داستانیں سنتے اور قصیدے لکھوا کر انعام دیتے۔

دوسرے مذہبی نقطۂ نظر سے سید الشہداء کی تعریف کے سوا کسی دوسرے کی تعریف مناسب نہیں۔

---

[1] عبداللہ یوسف علی۔ ہندوستانی تمدن برطانوی دورِ حکومت میں۔

تیسرے قصیدے کے جس قدر فنی کمالات ممکن ہو سکتے تھے وہ اس دور کی غزل نے اپنے میں جذب کر لئے تھے مشکل قوافی اور دقت مضامین دونوں ہی باتیں غزل میں آ چکی تھیں ہر ممکن قافیہ باندھا جاتا تھا اور غزلیں دو غزلے سہ غزلے تک پہونچ جاتی تھیں کہ طوالت کا احساس بھی تشنہ نہ رہے چنانچہ صاحب کاشف الحقایق ناسخ کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"وہ خیالات شیخ کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل ہو گئے تو درحقیقت احاطۂ غزل گوئی سے باہر ہیں"[1]

چوتھے قصیدے میں دہلی کے رنگ اور سودا کے طرز سے ہٹ کر نیا طرز نکالنے اور امتیازی خصوصیت پیدا کرنے کی گنجایش بہت کم تھی۔

ان سب کمیوں کو مرثیہ نے اس طرح پورا کیا کہ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری میں مرثیہ نے ایک بنیادی جگہ حاصل کر لی لکھنؤ کے سماج میں اس کی جگہ تھی اور ضرورت اور گنجایش بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرثیہ ایک نئی اور بے انتہا صلاحیتوں والی صنف کی حیثیت سے آگے بڑھا اور اس صنف میں مشاہیر پیدا ہوئے۔ میر ضمیر اور خلیق اور ان دونوں گھرانوں کے شاگرد اس صنف کو مالا مال کر گئے۔

غزل میں آتش و ناسخ نے تاریخی کارنامے انجام دئے ایک طرف ناسخ نے زبان کی طرف توجہ کی اور الفاظ کو شاعری کا محور بنایا اور زبان کو نوک پلک سے درست کیا دوسری طرف آتش نے بانکپن اور رندی کے ساتھ والہانہ پن کی روایات کو بھی قایم رکھا۔ ان دونوں اساتذہ کے اثرات دور رس ہوئے۔

نثر میں غازی الدین حیدر کے عہد میں جو شاہی مطابع کھولے گئے سائنس اور دوسرے علوم سے جو دلبستگی بڑھی وہ قابلِ ذکر ہے یہ پہلا دور ہے جب اُردو نثر ایک عنصر کی حیثیت سے ادب میں جگہ پانے لگتی ہے۔

غرض کہ اس دور میں لکھنؤ نے اپنی انفرادیت قایم کی جہاں اس نے ان تمام رجحانات سے کام لیا جو اسوقت تک کی اُردو شاعری میں پائے جاتے تھے وہاں اس نے نئے راستے بھی کھولے۔

چوتھا دور

محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے دور حکومت میں دربار شعر و شباب کی رنگینیوں سے زیادہ مذہبی پرہیزگاری کی طرف رجوع ہوا اور اس خشک علمی فضا کی مدد سے اس دور میں مرثیہ نے غزل پر فتح پائی۔ محرم اور دوسرے اثنا عشری رسوم پوری شان و شوکت سے۔ اور اس سے بھی زیادہ۔ سنجیدگی کے ساتھ منائی گئیں اس دور میں اودھ کی حکومت اسی طرح نزع کے عالم میں مبتلا رہی اور اس بے چارگی میں ایک نظر مذہب اور مذہبیت کی طرف

---

[1] کاشف الحقایق جلد دوم صفحہ ۱۳۹

بھی گئی۔ مختصراً یہ دور ایک عظیم الشان نظام کو ایک عظیم الشان خاتمے تک لانے کے لئے اہم تھا اور فی نفسہٖ اس میں تازگی اور زندگی کے آثار نہ پائے جاتے تھے۔

واجد علی شاہ نے اس کمی کو پورا کیا پہلے انھوں نے بھی نظام سلطنت[1] کو سنبھالنے کی کوشش کی اور دربار، فوج، انتظامی امور وغیرہ پر توجہ کی لیکن کمپنی اور اس کے ہواخواہوں کی مداخلت سے تنگ آکر اس ارادے کو ترک کیا اور شعر و ادب سے دل بہلانے لگے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں تہذیب کے ہر شعبے میں نشاۃ ثانیہ کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی انھوں نے اس تہذیبی اور تمدنی انفرادیت کو زیادہ واضح اور زیادہ شاندار بنا دیا جو لکھنؤ نے پیدا کی تھی انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں تہذیب اور شائستگی کی نوک پلک پیدا کی اور اس تمدن کو ایک ترقی یافتہ شکل میں چھوڑ گئے جسے شرر کے الفاظ میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

مذہب اور اس کے فرائض و رسوم کی ادائیگی میں مرثیہ خوانی اور دوسرے عناصر نے جگہ پائی جس سے یہ گریہ و ماتم بے روح اور خشک طور پر مذہبی ہونے کی بجائے ایک زندہ اور شاداب تقریب بن گیا۔ موسیقی اور شاعری کے امتزاج نے ڈرامے اور اسٹیج کو جنم دیا جو اُردو ادب ہی کے لئے نہیں پورے ہندوستان کے لئے اودھ کا ایک بے نظیر تحفہ ثابت ہوا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ذہنی سکون نے پھر ایک سہارا حاصل کر لیا تھا اور لوگ اطمینان اور سکون کی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ کہیں قدرت نے اپنا فیصلہ تبدیل تو نہیں کر دیا ممکن ہے کہ اودھ کے دربار کی یہ بڑھتی پھیلتی روشنی سدا بہار اور جاودانی ثابت ہو۔ چنانچہ طویل اور باوقار شعری کارنامے ظہور میں آنے لگے۔ اور لوگ مثنوی۔ مرثیہ اور ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ شعری روایات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ناسخ اور آتش کے شاگردوں نے اپنے اُستادوں کے طرز سخن کی پیروی ضروری سمجھی اور شاگردوں اور خاندانوں کا یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا۔ رشک۔ رند۔ صبا اور وزیر نے ان بنیادوں پر تعمیریں شروع کیں لیکن ان میں نہ وہ یقین و اعتماد ہے جو ناسخ کے یہاں ملتا ہے نہ متاعِ شاعری کو انہی حد بندیوں تک محدود رکھنے پر اصرار۔ لفظی ترکیبوں اور مناسبتوں سے جو لگاؤ ناسخ نے پیدا کیا تھا وہ ایک معیار سمجھا جانے لگا اور اس پر عمل بھی ہوا لیکن ان شاگردوں کے اثرات اس قدر قوی اور توانا نہیں کہ اس سطحی طرز کو جاوداں بنا سکیں یا کچھ آگے بڑھا سکیں۔

---

[1] محمد تقی : واجد علی شاہ۔

شرر : مشرقی تمدن کا آخری نمونہ۔ علاوہ ازیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں فوج کے نظم و نسق اور انتظامی امور پر لکھا ہوا واجد علی شاہ کا ایک رسالہ موجود ہے۔

اس دور میں آتش و ناسخ کے مخصوص اسالیب اور خصوصیات کا امتزاج دونوں کے شاگردوں کے کلام میں ملتا ہے، رندی اور بانکپن کے مضامین رشک اور وزیر کے کلام میں جگہ پاتے ہیں اور رند و صبا بھی ناسخ کی لفظی کاریگری کو اکثر جگہ آزماتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں دھارے ایک دوسرے سے قریب آرہے تھے۔

مرثیہ نے اس دور میں اپنی انتہائی بلندیوں کو چھولیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے زمزموں سے لکھنؤ گونج رہا تھا اور ان مراثی میں نئی تہذیب کی پوری فضا بول رہی تھی ان مراثی میں وہ تازگی، بے ساختگی اور سادگی تھی جو غزل میں نہیں ملتی۔ انیس اور ان کے شاگردوں نے اسی سادگی اور بے ساختگی کو معیار فن ٹھہرایا اور لفظی صنعت گری کو فن کا مرکز قرار نہیں دیا۔ دبیر کے کلام میں لفظی صنعت گری کے کافی نمونے ملتے ہیں لیکن وہ بھی مرثیہ کی اپنی فنی حدود اور داستان کی قیود سے مجبور ہو کر اکثر جگہ واقعیت اور سادگی سے کام لیتے ہیں۔ مرثیہ نے اپنے میں مثنوی کی سادگی اور قصیدے کا شکوہ جذب کرلیا اور چونکہ داستان کی رنگا رنگی اور ہمہ گیری ان عناصر کو اپنے میں سمو سکتی تھی، اس لئے مرثیہ ان نئے شاعرانہ جوہروں کے امتزاج سے زیادہ شاداب اور شاندار ہو گیا۔

نسیم کی مثنوی نے اُردو مثنوی میں ایک نئی روش دکھائی اور میر حسن کی مثنوی کے بعد گلزار نسیم کی سی مقبولیت کسی دوسری مثنوی کو حاصل نہ ہوئی۔ اس سے متاثر ہو کر لکھنؤ میں اُردو مثنویوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جو فنی حیثیت سے بھی گرانمایہ تھا فراہم ہو گیا۔ شوق۔ قلق اور واجد علی شاہ اختر کی مثنویوں کی ادبی قدر و قیمت میں شبہ نہیں۔

ادبی لحاظ سے تیسرا اہم کارنامہ امانت کی اندر سبھا تھی یہ اپنی انفرادیت کی وجہ سے اُردو ادب میں نئی چیز تھی مرثیہ غزل اور قصیدے سے الگ ہٹ کر امانت نے پہلی مرتبہ ایک طویل داستان کو مکالمے کے انداز میں اسٹیج کے لئے لکھا یہ ایک مکمل داستان ہے اور اس میں تسلسل اور تکمیل کا لحاظ رکھا گیا ہے گو فنی حیثیت سے اس میں بہت سی خامیاں ہیں پھر بھی اس کی بہت سی تصویریں زندگی اور تازگی سے بھرپور معلوم ہوتی ہیں۔

واسوخت اپنے ارتقا کی ابتدائی منزلیں طے کرتا ہوا اس دور میں اپنے نقطۂ کمال کو پہونچ گیا۔ واسوخت یوں تو بڑی پرانی صنف ادب ہے مگر اس کی اصل قدر و قیمت لکھنؤ ہی میں آکر واضح ہوئی آتش اور جرأت جیسے شاعروں نے اس میں طبع آزمائی کی اور اس دور میں امانت کے واسوخت نے اس کو فنی معراج پر پہونچا دیا۔ امانت کا واسوخت جس تاریخی عظمت کو حاصل کر سکا وہ کسی اور کو نہیں ملی۔

نثر میں رجب علی بیگ سرور کی ادبی تخلیقات نے گویا اُردو نثر کو ایک حسین پیکر کی طرح آراستہ کیا، فسانۂ عجائب، اور دوسری تصانیف نے اُردو نثر کو نئے آورش بخشے اور طرز بیان کے ادبی پہلوؤں سے آشنا کیا۔ اس کے زیر اثر نثر کی دوسری تصانیف بھی وجود میں آئیں۔

زبان کے سلسلہ میں رشک کا نفس اللغۃ اور دوسرے رسایل گویا لکھنؤ کی ادبی خدمات کو واضح صورت میں

پیش کرنے کی پہلی کڑی بنے اور آگے چل کر ان ہی کوششوں کی بنیاد پر زیادہ مضبوط عمارتیں کھڑی ہوئیں۔

یہ دور لکھنؤ کی نئی شاعرانہ انفرادیت کا پہلا دور ہے جس میں غزل کی نئی روایات نے تقلید کی منزلیں طے کیں اور تازہ تر اور شاداب تر روایات کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

پانچواں دور سیاسی لحاظ سے یہ اودھ کی سلطنت کے خاتمہ کا زمانہ ہے کمپنی بہادر نے اب اودھ پر بالواسطہ اختیار کو ضروری نہ جان کر اودھ کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ سلیمن اور دوسرے انگریز افسران کو برائے نام انتظامی معاملات پر رپورٹ دینے اور دوسرے نقایص ڈھونڈھنے کے لئے مامور کیا گیا اور آخر کار گورنر جنرل نے اودھ کی رعایا اور حکومت دونوں کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ اسے کمپنی کے زیر سایہ لے لیا جائے اور شاہی ختم کر دی جائے۔ واجد علی شاہ نے کوئی مقاومت نہیں کی اور یہ فرمان جاری کر دیا کہ انگریزی فوجوں کو بے چون وچرا تمام انتظام و انصرام دے دیا جائے، اودھ کی حکومت نے ہتھیار ڈال دئے کیونکہ شاہ کو ابھی تک انگریزوں کی نیک نیتی پر اعتماد اور ان کی قانون پرستی کے بارے میں خوش فہمی تھی اور وہ یہ امید رکھتے تھے کہ برطانوی پارلیمان ان کے حق میں فیصلہ کر کے کمپنی کے فیصلہ کو غلط ٹھہرائے گی اور ایسی صورت میں مقابلہ اور مقاومت انکے معاملہ کے بارے میں پارلیمان کی رائے کو خراب کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے گا۔

یہ واقعہ سیاسی لحاظ ہی سے اس قدر اہم نہیں ہے بلکہ تہذیبی اور ادبی نقطۂ نظر سے یہ ایک شاندار دور کے خاتمے کا اعلان ہے اور ایک ایسے تمدنی دور کے خاتمے کا اعلان جو ہندوستان کی تہذیب کی صدیوں کی کمائی تھا اور جو آیندہ میسر نہ ہو سکے گا۔ یہ ایک ایسے تمدنی گرہن اور تہذیبی بے ترتیبی کا آغاز ہے جس سے آجتک ہندوستانی تہذیب باہر قدم نہیں نکال سکی ہے۔

اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اودھ میں شعر و ادب کا محور دربار تھا دربار کی تباہی اور امراء کی ابتری نے شاعروں کو پریشان حال کر دیا اور وہ انتشار اور بے اطمینانی جو اُردو شعرا کو دہلی سے لکھنؤ لانے کی ذمہ دار تھی لکھنؤ میں بھی آموجود ہوئی۔ لکھنؤ کی مرکزیت ختم ہوئی تو یہاں کے شعرا اور صاحبِ کمال حضرات نے دوسری ریاستوں میں قسمت آزمائی کرنے کے لئے کمر باندھی کچھ فرخ آباد اور ٹانڈہ کی طرف گئے، کچھ نے عظیم آباد اور مرشد آباد کے لئے زادِ سفر لیا کچھ ہمت کر کے حیدر آباد جا پہونچے مگر لکھنؤ کے بعد شاعروں کا سب سے بڑا اجتماع رام پور میں ہوا یہاں لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ کے اہلِ کمال اپنے وطن کی ویرانی اور تباہی کے بعد پناہ لینے پہونچے تھے چنانچہ ہمیں لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی آخری شمعیں اسی دربار میں روشن دکھائی دیتی ہیں اور یہیں دبستانِ شاعری ایک الگ دبستان کی حیثیت سے اپنی انفرادیت ختم کر کے اُردو شاعری کے دھارے میں موجِ خوش آب کی طرح مل جاتا ہے۔

امیر۔ جلال۔ اور تسلیم اس دور کے خاص شاعر ہیں لیکن رام پور پہونچے تو داغ کے رنگ کو مقبول ہوتے دیکھا دہلی کے رنگ کی وارفتگی، بے ساختگی، اور سادگی کو درد و گداز اور سچے جوش اور خلوص سے وابستہ کرنا مناسب سمجھا اور لفظی صناعی اور مناسبت لفظی کی حد سے زیادہ پابندی ترک کی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کی تاراجی سے وہ صورتیں لکھنؤ کے شعرا کے لئے بھی پیدا ہوگئی تھی جو حقیقی سوز و گداز پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس دور کے غزل گو شعرا کی آواز میں ایک انوکھی کیفیت ہے۔ یہ حقیقی شاعری سے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی لکھنوی ہیں۔

مرثیہ نگاری نے انیس اور دبیر کی گزشتہ عظمتوں کو فراموش نہیں کیا۔ تعشق۔ نفیس۔ عشق۔ مونس۔ جلیس۔ عارف۔ رشید۔ اوج۔ کا سلسلہ انیس و دبیر کے سلسلہ کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ گو وہ مجلس منتشر ہوگئی۔ مگر مرثیہ نگاری کا خلوص اور ان کا عقیدتمندانہ اظہار قایم رہا اور مرثیہ نے گو اس عہد سے اپنی ترقی کی آخری منزل بھی طے کرلی اور آگے وہ ایک ادبی طاقت کی شکل میں قایم نہ رہ سکا پھر بھی مرثیہ نگاری میں اس آخری دور کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

مثنویاں اس دور میں بھی لکھی جاتی رہیں جن میں کچھ کامیاب مثنویاں بھی تھیں۔ واجد علی شاہ کی مشہور مثنوی ان کے تخت سے دست بردار ہونے کے بعد ہی لکھی گئی ہے اور ہر حیثیت سے کامیاب ہے مگر وہ سماں ختم ہو چکا تھا سکون کی جگہ انتشار عام تھا اس لئے مکمل تاثر پاروں کی تصنیف کا پھر زوال ہوا۔ مثنوی، اندر سبھا قسم کے ڈرامے جن میں امانت اور مداری لال جوہر دکھا چکے تھے۔ واسوخت اور اس قسم کی دوسرے تخلیقات کو زوال ہوا۔

زبان میں جلال اور امیر کی کوششوں کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے امیر کی امیر اللغات، جلال کی سرمایۂ زبان اُردو اور متعدد دوسرے رسائل نے زبان کا ایک تفصیلی جایزہ لینے کی کوشش کی اس کے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔

نثر میں رجب علی بیگ سرور کچھ کہانیاں اور قصّے لکھتے رہے اور ان کے زیر اثر دوسری تصانیف بھی پیش کی جاتی رہیں۔ گلزار سرور ان کی تصانیف میں مشہور ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد دور جدید کا دور دورہ ہوا اور نئے نئے مطابع نے طباعت و اشاعت کے کام شروع ہوئے اور نئے ادبی کارنامے ظہور میں آنے لگے۔

امیر و جلال کے بعد گو ان کے شاگردوں نے ان روایات کو زندہ رکھا اور لکھنؤ میں شعر و شاعری کی عنان ایک عرصہ تک انہی خاندانوں کے ہاتھ میں رہی لیکن اب زمانے کا رخ پلٹ چکا تھا اور اُردو شاعری نئی منزلوں کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ غدر کے بعد سرسید اور حالی نے شاعری کو ذریعۂ دولت اور دربار داری سے الگ ہٹانے کا نعرہ بلند کیا کہ اب اس نظام کا کوئی مستقبل نظر نہ آتا تھا انھوں نے پرانی حد بندیوں کی مخالفت کی غزل میں زیادہ واقعیت اور سچائی پر زور دیا۔ نظم کی ترویج کی اور ہوا کا رُخ دیکھ کر اپنی کشتی اسی سمت میں کھینے لگے

جو اب تک کی اُردو شاعری کے لئے نئی تھی اس نئی فضا میں لکھنؤ اور دہلی کی آوازیں مدھم پڑنے لگیں غزل گوئی میں گو وہ رنگ اور طرز خال خال ہی باقی رہا اور شعرا کے خاندان چلتے رہے لیکن ان میں سے کوئی ایسا عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا جو ان ہی بنیادوں کے امتیاز پر نئی بلندیاں حاصل کرتا اور اُردو شاعری کے مستقبل کے تعین میں کارفرما ہو سکتا ہاں لکھنؤ کے ادبی اثرات البتہ نہایت دور رس تھے اور ان اثرات نے غزل اور نظم ہر قسم کی شاعری میں اپنا جلوہ دکھایا اور روایات کی پشت پناہی میں سب سے واضح اور قطعی عمل انہی اثرات کا رہا۔

نئی تحریک کا اثر لکھنؤ کے ادبی حلقوں پر بھی پڑا اور یہاں انجمن معیار کی داغ بیل پڑی انجمن معیار کے اراکین نے حقیقی شاعری اور سوز و گداز کی طرف قدم بڑھایا اور لکھنؤ کے قدیم رنگ سے دامن کھینچا۔ صفی۔ عزیز۔ ثاقب۔ محشر وغیرہ نے میر کی شاعری کو اپنا آدرش قرار دیا اور اس طرح لکھنؤ کی ادبی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔

نثر میں بھی نئی طاقتوں کا ظہور ہوا۔ نول کشور پریس اور اودھ پنچ اور اودھ اخبار نے اُردو نثر میں ایک انقلاب پیدا کیا اور ان دونوں اخباروں کے زیر سایہ اُردو نثر نگاری کا ایک مدرسۂ فکر پرورش پانے لگا۔ اکبر اور چکبست۔ شرر اور سرشار۔ ظریف اور مرزا سجاد حسین نے اُردو نثر کو ایک نئے لہجے سے آشنا کیا۔

محمد حسن (ام۔ اے)

دواوین و مجموعۂ کلام

دیوان ذوق --- مرتبہ آزاد ---- تین روپے
دیوان حالی ---------- ڈھائی روپے
دیوان وفا ---------- دو روپے
دیوان اثر دہلوی ---------- ڈیڑھ روپیہ
دیوان تاباں دہلوی ---------- ایک روپیہ
دیوان ظفر ---------- بارہ آنے
دیوان رضا فرنگی محلی ---------- دو روپے
دیوان دروغ ---------- ایک روپیہ
انتخاب سودا --- مرزا ثاقب --- ڈیڑھ روپیہ
باقیات فانی ---------- تین روپیہ
تابشِ خیال --- افسر امروہوی --- ایک روپیہ

رمز و کنایات -- فراق گورکھپوری -- تین روپیہ آٹھ آنہ
مجموعہ نظم بے نظیر -- نذیر احمد ---- ڈیڑھ روپیہ
مشعل ---------- " " ---- دو روپیہ بارہ آنے
شبنستاں ---------- " " ---------- چھ روپے
سبدِ گل ---- شاعر لکھنوی ---------- ایک روپیہ
شاعر کی راتیں -- چوشش --- ایک روپیہ آٹھ آنہ
رباعیات شاد ---------- چار روپے
ظہور رحمت --- شاد عظیم آبادی --- ایک روپیہ
قصاید ذوق ---------- ایک روپیہ بارہ آنہ
مطلع الانوار --- برق دہلوی ---- دو روپے
نقش و نگار -- جلیل احمد قدوائی -- ایک روپیہ آٹھ آنہ

روس اور عورت

۸ر جولائی ۱۹۴۸ء کو سوویٹ حکومت نے خاندان کے متعلق ایک نیا قانون نافذ کیا۔ جس میں سلیقہ شعار ماؤں کے لئے تین نئے اعزاز۔ "مدر ہیروئین" "گلوری آف مدر ہڈ" اور "میرٹنٹی میڈل"۔ قایم کئے گئے۔ علاوہ اسکے کثیر الاولاد ماؤں کے لئے بچوں کی تعداد کے مطابق اڑھائی سو سے لیکر تین ہزار ایک سو پچیس روپے تک امداد اور پچاس سے لیکر ایک سو نوے روپے ماہوار تک وظیفہ مقرر کیا گیا۔ حکومت نے بیوہ ماؤں کی اولاد کی پرورش اور تعلیم کی جملہ ذمہ داری بھی اپنے سر لی۔

اس قانون میں حاملہ عورتوں کے لئے بھی بہت سی سہولتیں بہم پہونچائی گئی ہیں۔ زچہ خانہ کی چھٹیوں کی تعداد کم از کم ۷۷ دن مقرر کی گئی اور یہ تعداد ضرورت پر بڑھائی بھی جا سکتی ہے حاملہ عورتوں، شیر خوار بچوں کی دیکھ بھال کے لئے سوویٹ یونین کے طول و عرض میں آرام گاہوں، زچہ خانوں، مخصوص دواخانوں پرورش گاہوں طفل گاہوں کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔

اس نئے قانون زناشوی کے آئین میں ایک خاص تبدیلی یہ کی گئی کہ اب سوویٹ یونین میں صرف ان شادیوں کو تسلیم کیا جاوے گا جو رجسٹری کرائی گئی ہوں اور اسی طرح طلاق کے لئے بھی اب عدالت کا فیصلہ ضروری ہوگا جس میں فریقین کے بیانات عوام کے سامنے لئے جائیں گے۔ طلاق منظور کرنے کے اختیارات صوبہ، حلقہ۔ اور شہر کی عدالتوں کو ہوگا۔

سوویٹ حکومت نے جو پابندی طلاق پر لگائی ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جو طریقہ رائج تھا یا تو وہ غلط تھا۔ اور یا اب سوویٹ یونین میں اشتراکی اصولوں کو ترک کیا جا رہا ہے، لیکن سوویٹ یونین کے موجودہ حالات کا مطالعہ ان دونوں باتوں کی تردید کرتا ہے، سوویٹ یونین کے قوانین کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی ہے، کہ قانون انسان کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ انسان قانون کے لئے چنانچہ وہاں کے قوانین سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ اور ضروریات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ان کا تبدیل ہونا لازمی تصور کیا جاتا ہے۔

زار شاہی روس میں خاندان اور زناشوی کے قوانین کی بنیاد جیسا کہ سرمایہ دارانہ سماج کا دستور ہے اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ عورت مرد کی رفیق نہیں پاؤں کی جوتی ہے۔ جسے جب چاہا پہن لیا جب جی چاہا

اُتار دیا جب جی چاہا بدل لیا جب جی چاہا پھینک دیا اُس وقت وہاں عورت سماج کی نہ تو فرد سمجھی جاتی تھی اور نہ اس کے کچھ حقوق تھے۔ تعلیم و ترقی کی راہیں، مسدود تھیں صرف شادی ہی ایک ایسا ذریعہ تھی جس سے عورت سماج میں کچھ وقعت حاصل کر سکتی تھی لیکن زار شاہی روس میں دیگر سرمایہ دارانہ ملکوں کی طرح شادی کے لئے فریقین میں محبت کا ہونا بالکل غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔

چنانچہ غیر موزوں بے جوڑ اور عاری از محبت شادیوں نے عورت کو اور بھی مرد کا محتاج اور دست نگر بنا دیا تھا، مرد عورت کا ان داتا۔ سرتاج۔ مالک اور نہ معلوم کیا کیا ہوتا تھا اور اس کے نادری فرمان بجا لانا اور ہٹلری ظلم سہنا عورت کا مذہبی اور سماجی فرض قرار دیا جاتا تھا اگر عورت شوہر کے ظلم ستم اور چیرہ دستیوں سے تنگ آکر گھر سے بھاگ کھڑی ہوتی تو حکومت اس کو پکڑ کر پھر شوہر کے حوالے کر دیتی، طلاق کے لئے یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ فریق مخالف زنا کا مرتکب ہوا ہے جس میں مرد سے کہیں زیادہ عورت ذلیل ہوتی تھی۔

اشتراکی انقلاب نے جہاں زار شاہی کا خاتمہ کیا، وہاں زنا شوئی اور خاندان کے دقیانوسی آئین کو بھی تہ خاک کر کے رکھ دیا۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو سوویٹ حکومت نے نئے قوانین کا اعلان کیا۔ جن میں زنا شوئی اور طلاق کے بھی قوانین موجود تھے ان قوانین نے عورت کو مرد کی غلامی سے آزاد کر کے برابر کے حقوق دئے ۱۹۱۷ء کے قوانین میں واضح کر دیا گیا تھا کہ سوویٹ خاندان کی بنیاد ان شادیوں پر رکھی جائیگی جن میں فریقین بلا روک ٹوک محبت کی بنا پر اپنے ساتھی کا انتخاب کریں گے اور جن میں فریقین کی حیثیت مساویانہ ہوگی۔

لیکن زنا شوئی کے معاملہ میں عورت کو مرد کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے یہ اعلان کافی نہ تھا کیونکہ زار شاہی عہد میں جو شادیاں ہوئی تھیں۔ ان کی بنیاد محبت پر نہ تھی بلکہ اقتصادی مفاد یا شہرت وغیرہ کو مدِ نظر رکھ کر کی گئی تھیں ان شادیوں کا منسوخ ہونا از حد ضروری تھا ورنہ وہ عورتیں جنھیں انقلاب سے پہلے بیاہا جا چکا تھا سوویٹ آئین سے ہرگز مستفید نہ ہو سکتیں۔ چنانچہ طلاق کی تمام پابندیاں دور ہو گئیں۔ فریقین میں سے کسی ایک کی درخواست پر طلاق منظور ہو جاتی۔ طلاق کی درخواست کے لئے عدالت میں سماعت ضروری نہ تھی بلکہ مقامی رجسٹراروں کو یہ اختیارات دئے گئے تھے کہ وہ طلاق کی منظوری دے دیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض غیر مستقل مزاج لوگوں نے اس قانون سے ناجائز فایدہ اُٹھایا تاہم اس قانون سے اتنا فایدہ ہوا کہ زنا شوئی کا وہ فرضی آسمانی بندھن ٹوٹ گیا۔ جس سے عورت کو غلام بنایا جاتا تھا اور گھریلو زندگی میں اسے پست درجہ دیا جاتا تھا۔ اس قانون نے خاندان اور زنا شوئی کی عمارت کو جمہوری اصولوں پر اُبھارا۔ اور جو لوگ اپنی غیر مستقل مزاجی کے باعث گمراہ ہو گئے تھے سوویٹ عوام نے ان کی اچھی طرح خبر لی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ زنا شوئی کے قوانین کی ترمیم کے ساتھ ساتھ سوویٹ حکومت نے عورت کو مکمل آزادی

دینے کے لئے آئینی حقوق کے علاوہ رہائش خوراک اور کام کی سہولتیں بھی بہم پہونچائیں۔ اور سرکاری امداد دے کر اچھی تعلیم حاصل کرنے ذریعۂ معاش حاصل کرنے اور سماج کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں تمام آسانیاں پیدا کر دیں، عورت کو سماج کا جزو تسلیم کیا اسے سرکاری محکموں اور خدمت عامہ میں مرد کے برابر درجہ دیا بچوں کی پرورش کی تمام ذمہ داری حکومت نے لے لی اور اس طرح عورت کو گھر کی چار دیواری اور مرد کی غلامی سے نکال کر سماج کا کارآمد رکن بنا دیا۔

ان تمام اقدامات کے نتائج جلد ہی ظاہر ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں ۷۹۴۰ عورتیں یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور یہ تعداد طلبا کی کل تعداد کا ۲۸ فی صدی تھی۔ اسی طرح ۲۱۹۰۰ عورتیں انجینیر اور اعلیٰ کاریگر تھیں جن مقامات پر عورتیں زیادہ پیچھے رہ گئی تھیں وہاں بہت سی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں اور وہ آج ازبکستان، تاجکستان، جارجیا، آرمینیا، اور آذربائیجان میں ذمہ دار سرکاری عہدوں پر مامور ہیں۔ مجلس وزرا میں اجتماعی کھیتوں پہ کارخانوں میں غرضیکہ ہر جگہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے عورتوں کے پاس ہیں۔ یہ ان مقامات کا ذکر ہے جہاں آج سے چند سال پیشتر گھر کی چار دیواری سے نکلنے یا چہرہ پر سے برقعہ ہٹانے کے جرم میں ان کے شوہر قتل کر ڈالتے تھے۔

اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جاوے کہ سوویٹ حکومت کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تو اس ترقی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد پانچ سالہ خانہ جنگی کے باعث اقتصادی نظام تہ و بالا ہو گیا تھا ہر طرف قحط و وبا کا دور دورہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ جہالت اور قدامت پسندی کی تاریکی گھر گھر کو گھیرے ہوئے تھی، ایسی صورت میں سوویٹ عورت کے سامنے صرف دو راستے تھے — یا تو وہ پرانی بھیانک اور تاریک دنیا میں جو باورچی خانہ اور گھر کی چار دیواری تک محدود تھی واپس جائے اور یا ہمت کر کے آگے قدم بڑھائے مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرے۔ کارآمد شہری بننے کے لئے تعلیم حاصل کرے۔ سماجی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے اور انسانیت کے فلاح بہبود کی خاطر حالات کا مقابلہ کرے سوویٹ عورت نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور گھر میں گھر سے باہر سماجی۔ سیاسی۔ معاشی۔ تعمیری۔ الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے دوش بدوش چلی اور اس طرح زنانہ شوی اور خاندان کو نئے اصولوں پر ترتیب دیا۔

اس ترقی کی راہ میں عورتوں کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان کے رشتہ دار خاص طور پر قدامت پسند شوہر ہر طرح سے ان کے راستے میں روڑے اٹکاتے اور جا و بے جا ان کی مخالفت کرتے ایسی فضا میں انکی خود اعتمادی ہی اسے صراطِ مستقیم پر رکھ سکتی تھی اس کے لئے بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ پچھلی کوئی مثال سامنے نہ تھی جس میں آزادی کے جذبے کے ساتھ ساتھ نسوانیت اور اس کی تمام تر خوبیاں مل سکتیں تاریخ اس سلسلہ میں خاموش تھی۔ اور

روایات گمراہ کن۔ چنانچہ انھیں سب کچھ "حال" ہی سے سیکھنا تھا۔ غلط قدم اُٹھ جاتا تو خمیازہ بھگتنا پڑتا۔

انقلاب اور خانہ جنگی کے زمانہ میں اکثر عورتوں نے اپنے والدین، بھائیوں اور شوہروں کا لڑائی کے خطرناک مرحلوں میں ساتھ دیا۔ ان کے ساتھ فوجی زندگی کی سختیاں بھی جھیلیں۔ فاقے بھی کئے اور دشمنوں کے وار بھی جھیلے۔

جب خانہ جنگیوں کے بعد تعمیری بیڑا اُٹھایا گیا تو قومی اقتصادیات کی تعمیر نو کے لئے اس چیز کی ضرورت تھی کہ عورت اپنے پیشوں میں بھی مہارت حاصل کرے۔ جو اب تک صرف مرد کا حق سمجھے جاتے تھے۔ سوویٹ صنعت و زراعت کی اصلاح نے اور بعد ازاں پنج سالہ پروگراموں نے اور بھی زیادہ عورتوں کو قومی کاموں کی طرف کھینچا۔ عورتیں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کارخانوں۔ اور فیکٹریوں میں ہوائی جہازوں اور بحر کے محکموں میں۔ فنون لطیفہ، سائنس۔ اور تعمیر کے اداروں میں آگئیں۔ اور جلد ہی اپنی محنت، بے غرضی اور صبر سے اپنے کو ان تمام ذمہ داریوں کا اہل ثابت کر دیا۔ یہ کام بلا ایثار سر انجام پانا مشکل تھا۔ سب سے بڑا ایثار یہ تھا کہ اپنے گھر اور بچوں کی طرف متوجہ ہونے کی انھیں کم فرصت ملتی تھی۔ شوہر کی محبت اور صحبت سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی زیادہ وقت نہ ملتا تھا۔ کپڑوں اور بناؤ سنگھار کا تو ذکر ہی کیا۔

سوویٹ عورت کی اکثریت اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ گھریلو زندگی اور ان کے منصبی فرائض کی ٹکر عارضی ہے۔ وہ اس ٹھوس حقیقت سے بھی آگاہ تھی کہ ——————————

——— بلا محنت اور قربانی کے انجنیر، ڈاکٹر، استاد۔ سائنسداں، کاریگر۔ وغیرہ بننا ناممکن تھا۔

——————— اس لئے انھوں نے خوشنما اور بھڑکیلے ملبوسات چھوڑ کر اور ہر طرح کے اخراجات میں کمی کر کے صدیوں کی کمی کو پورا کیا اور حقیقی برابری حاصل کرنے کے لئے حیرت انگیز ترقی کی۔ لیکن ان تمام کاوشوں کے باوجود سوویٹ عورت نے اس نسوانی جذبہ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ جو نسوانیت کی جان ہے۔ مستقل گھر بسانے، ماں بننے، محبت کرنے اور شوہر کے ساتھ دائمی محبت کی زندگی گزارنے کی تمنا اس کے دل میں سے کبھی نہ گئی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چند عورتیں جنسی بیماری کا شکار ہو گئیں اور انھوں نے مردانہ طور طریقہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ سوویٹ یونین کے مخالف اب تک یہی اعتراض اپنے خلاف پیش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس چیز کو خود سوویٹ یونین نے بھی بری نگاہ سے دیکھا اور یہ بیماری جو معدودے چند عورتوں میں پیدا ہوئی تھی —— زیادہ نہ بڑھی۔

اسٹالین کی پہلی پنج سالہ اسکیم نے سوویٹ سماج کو بہت اعلیٰ تمدنی درجہ پر پہونچا دیا۔ اور سوویٹ عورت

کے لئے گھریلو کام اور سرکاری کام نجی زندگی اور سماجی زندگی میں تضاد نہ رہا۔ اور انجینیری، ڈاکٹری اور دیگر مختلف اہم پیشوں نے ان کو موقع دیا کہ وہ اپنے گھر کو پہلے سے کہیں زیادہ بہتر پیمانہ پر آراستہ کریں۔ اور اپنے بچوں کی زیادہ سے زیادہ اچھے طریقہ سے دیکھ بھال کریں اس طرح سے خاندان میں عورت کا رتبہ مرد کے برابر ہو گیا اور سوویٹ خاندان میں اب نئی زندگی پیدا ہو گئی۔

سوویٹ حکومت نے بھی بچوں کی دیکھ بھال بڑھا دی ——— اور گھر کو بچہ کی تعلیم کا مرکز تسلیم کرتے ہوئے بچوں کی صحیح پرورش و تعلیم کے واسطے ماؤں کی ہر طرح سے مدد کی۔ ماں جو کہ سوویٹ نظام کے ابتدائی دور میں گھر اور بچوں کی طرف پوری توجہ نہ دے سکتی تھی۔ دوبارہ اپنے فرض کو بھی پورے طور پر انجام دینے لگی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ پھر اپنی پرانی حالت پر پہونچ گئی یا اس نے اپنی آزادی اور برابری کو بالائے طاق رکھدیا اب وہ جاہل تنگ نظر ناکارہ عورت نہیں ہے۔ بلکہ اب تو وہ سوویٹ سماج کی روحِ رواں ہے۔ ملک اور سماج کی بہتری اس سے وابستہ ہے۔ شوہر کی صحیح معنوں میں شریک زندگی اور اس کی غمگسار ساتھی ہے۔ ایسی ہی مائیں اپنے بچوں کو صحیح تعلیم دلا سکتی ہیں۔ ان کی دلچسپیاں سمجھ سکتی ہیں۔ ان کے اخلاق کو سدھار سکتی ہیں اور ان کو ملک کا جاں نثار بنا سکتی ہیں۔

میکسم گورکی نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ محبت کرنے کو تو مرغی بھی اپنے بچہ سے کر سکتی ہے۔ لیکن بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت بے حد ضروری ہے اور اس کے لئے قابلیت تجربہ اور زندگی سے واقفیت کی ضرورت ہے۔

سوویٹ عورت میں جو یہ تمام خصوصیات اسوقت پائی جاتی ہیں ان کے حاصل کرنے میں اس نے بے حد مصیبتیں جھیلی ہیں۔

لیکن ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۴ء تک سوویٹ عورت اور اس کی حالت میں کیا تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس کے جاننے اور شادی کے نئے قوانین کو صحیح طور پر سمجھنے کے واسطے کپتان لڈملا زائی فاف کا خط درج کرنا بڑا ضروری ہے یہ سرخ فوج کے ساتھ ماسکو سے لیکن تک لڑائی کے تمام اہم کارناموں میں شریک رہی ہیں اور ان کو بہادری کے صلہ میں دو بار تمغے مل چکے ہیں۔ لکھتی ہیں :-

"دوسری بار تمغہ ملنے پر جب سپاہیوں نے مجھے مبارک باد دی۔ تو میں سوچنے لگی اگر میں زار کے عہدِ حکومت میں ہوتی اور میرا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا جس کے تنگ دائرے میں میری زندگی محدود ہوتی اور صرف گھریلو کام کاج میری دنیا ہوتی تو ——— مجھے اس خیال سے ڈر لگنے لگتا۔ تاہم مجھے اس کی تمنا ہے کہ میرا خاندان ہو جس میں آرام کی زندگی بسر کر سکوں۔ ایک اپنا الگ کونا ہو جس میں نسوانی زندگی کی خوشی کی گھڑیاں گزار لوں یہ تمنا اسوقت اور بھی زیادہ ہے، جبکہ ہماری فتح بالکل قریب ہے اور ہمارے سپاہی گھر جانے کو بے قرار ہیں۔"

گزشتہ ۲۵ سال میں سوویٹ نظام نے ایک ایسی نسل طیار کرلی ہے جس کا اخلاقی معیار نیا اور بلند ہے۔ اور جس کا نظریۂ محنت و مشقت بالکل نیا ہے ——— سوویٹ عورت بھی حقیقی برابری حاصل کرنے کے بعد بالکل بدل چکی ہے۔ وہ کیا کچھ کرسکتی ہے۔ پچھلی جنگ نے ساری دُنیا پر ظاہر کردیا ہے۔ میدان جنگ میں اور میدانِ جنگ سے دور۔ محاذ پر۔ گوریلوں کے رسالوں میں۔ ریڈ کراس کے ساتھ۔ زراعت۔ صنعت۔ آرٹ اور سائنس میں جو اس نے کر دکھایا۔ اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی آج مالی اخلاقی سماجی ذہنی یا اور کسی قسم کی ناہمواری ہئی نہیں جس کا خیال سوویٹ عورت کی شادی کے وقت رکھنا پڑتا ہو وہ سوویٹ یونین کی باعزت فرد ہے۔ اور اس کو اپنی خوشی کے مطابق گھر اور خاندان چلانے کی پوری آزادی حاصل ہے عورت کی تبدیلی کی وجہ سے عورت کی طرف مرد کا بھی تصور بدل چکا ہے، شادی اور خاندان کے پرانے تصورات جو صدیوں سے ورثہ کی طرح روس میں چلے آرہے تھے اب بالکل معدوم ہوچکے ہیں۔ اب سوویٹ یونین میں گھر اور اس کی مسرت کی بنیاد کچھ اور ہے ——— سوویٹ یونین کے انقلاب میں اس نئی سماج کی بنیاد وہ ہے "جس کے بارے میں انگلز نے لکھا تھا کہ اب مردوں کی نسل مالی یا سماجی فوایدہ کے واسطے عورت کو نہ خرید سکے گی اور نہ عورت اپنے آپ کو مرد کے حوالے محبت کے علاوہ اور کسی سبب سے کرے گی۔

ایسی صورت میں جبکہ سوویٹ سماج ترقی کرکے اس حد تک پہونچ چکا ہے جبکہ خاندان کی بنیاد مرد اور عورت کے باہمی احساسات۔ باہمی محبت باہمی عزت اور ہم خیالی پر قایم ہے سوویٹ حکومت مجبور تھی۔ کہ دسمبر ۱۹۱۸ء کے قوانین کو بدلے جو سماج کو اس حالت پر پہونچانے کے واسطے بنائے گئے تھے۔ اور جو خیالات نئے حالات میں ناکافی ثابت ہوئے ہیں۔ اب خاندان نئی نسل کے نشو و نما کا مرکز ہے، خاندان جتنا خوشحال اور مستقل ہوگا۔ اس کا اتنا ہی اثر بچوں پر پڑے گا۔ بچوں کی تعلیم تربیت کے واسطے والدین حکومت اور سماج کے آگے جواب دہ قرار دئے جاتے ہیں۔ خاندان۔ گھر اور اولاد کی خواہش سوویٹ یونین کے لوگوں کی رگ رگ میں پیوست ہے جس کا اظہار لڈمیلا زائی ناف کے خط سے ہوتا ہے۔

ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پرانے قوانین جنھوں نے طلاق کو آسان بنا رکھا تھا، خاندان کو مضبوط بنانیکا مقصد حل نہیں کرسکتے۔ برخلاف اس کے ان کی وجہ سے غیر پائیداری کا احساس ہوسکتا ہے اور والدین کے دل میں وہ سنجیدگی پیدا نہیں ہوسکتی جس سے بچوں کی تعلیم و تربیت اور خاندان کی خوشی بڑھ سکے۔

نئے قوانین کے مطابق طلاق بغیر عدالتی تفتیش کے نہیں ہوتی۔ طلاق کے مقدمہ کی پیشی عوام کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ اس کی اطلاع عوام کو دیجاتی ہے۔ عدالت طلاق کے مقصد پر غور کرتی ہے۔ ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ میاں بیوی میں سمجھوتا ہوجائے۔ ——— فریقین کی درخواست پر اگر عدالت ضروری سمجھے تو اس کو اختیار ہے کہ مقدمہ کی کارروائی عوام کے سامنے نہ کی جائے اگر عدالت

دونوں میں صلح کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تو طلاق کی درخواست اعلیٰ عدالت میں بھیجی جاتی ہے اور طلاق کی اجازت صوبہ ضلع یا حلقہ کی عدالت سے دی جاتی ہے۔ طلاق کی منظوری کے ساتھ عدالت یہ بھی طے کرتی ہے کہ کونسا بچہ دونوں میں سے کس کے پاس رہے گا۔ اور بچہ کی پرورش کے واسطے ان میں سے کس کو کتنا خرچ دینا ہوگا۔ گھریلو مالیت کی تقسیم بھی عدالت ہی کرتی ہے۔ طلاق کا ایک سارٹیفکٹ بھی دیا جاتا ہے۔ یہ قانون دسمبر ۱۹۱۸ء کے قانون سے بہت مختلف ہے جس میں طلاق میاں بیوی میں سے کسی ایک کی درخواست پر منظور ہو جاتی تھی۔ اور جس میں مقدمہ ضروری نہ تھا بلکہ صرف ایک درخواست پر سب رجسٹرار کے دفتر بھیجی جاتی تھی۔

نئے قانون نے سوویٹ خاندان کی بنیاد مضبوط اور مستقل کرنے کے واسطے مقدمہ کی کارروائی ضروری کر دی ہے سوویٹ عوام کا دھیان اس بات کی طرف منتقل کیا گیا ہے۔ کہ گھر بچہ کی تعلیم و تربیت کا گہوارہ ہے اور اس لئے شوہر اور بیوی دونوں کا فرض ہے کہ ان کے امکان میں جہاں تک ہو گھر کو بچہ کے لئے بہترین تعلیم گاہ بنائیں اور اس بات کو مدِ نظر رکھیں کہ بچہ کی تعلیم ان کی نجی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک سماجی فرض ہے اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ سوویٹ حکومت ان شخصیتوں کو جبراً ایک ساتھ باندھ کر رکھے گی۔ جن میں نہ محبت ہے اور نہ ہم خیالی۔ بلکہ ایسے معاملوں میں حکومت طلاق کی اجازت معقول تحقیقات کے بعد دے گی۔ مقدمہ کے دوران میں طلاق کی وجوہ کا ناکافی ہونا دونوں فریقین کو اچھی طرح سمجھایا جائے گا۔ اور ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ بنے بنائے گھر کو نہ بگاڑا جائے اس کے علاوہ طلاق کے مقدمہ کی کارروائی کا عوام میں ہونا لوگوں کو مجبور کرے گا کہ شادی کے لئے زندگی کا ساتھی تلاش کرتے وقت زیادہ سنجیدگی سے کام لیں۔ اور اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس کریں، شادی سے پیشتر مرد اور عورت ایک دوسرے کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان احتیاط کی وجہ سے ایسی شادیاں جو اکثر خانہ بربادی کا باعث ہوتی ہیں بالکل بند ہو جائیں گی۔

اس نئے قانون نے گھر کو سوویٹ سماج کا محور قرار دیا ہے۔ سماجی رشتوں کا نیا معیار قایم کیا ہے اور ماں اور بچوں کی بہبودی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے سامان مہیا کر دیا ہے۔ یہ نیا قانون سوویٹ خاندان کو زیادہ مضبوط اور بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ سوویٹ نظام کو بھی اعلیٰ بنا دے گا۔ سردار ہر جنس کور

مالہ وماعلیہ

جوش، جگر، سیماب وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی وہ بھی ایسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پہ تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ فنِ شعر کتنا نازک فن ہے اور بڑے سے بڑا شاعر بھی کبھی دیکھی اس میدان میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ سرورق رنگین، قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

داغ و امیر کے غیر مطبوعہ خطوط

داغ کے خط امیر کے نام:۔

میرے دل کو تسلّی دینے والے سلامت رہو۔ تعزیت نامہ آیا اور بھی مجھ کو رُلایا۔

ایک طوفاں ہے غمِ ہجر میں رونا کیا ہے　　نہیں معلوم کہ انجام کو ہونا کیا ہے

تمام عمر کا رفیق اور عاشقِ زار مجھ سے چھُٹ گیا۔ کس سے کہوں کیا کروں۔ سخت صدمہ ہے، کوئی عزیز اپنے پاس نہیں۔ خانہ داری کے کام کرنا پڑتے ہیں جو تمام عمر کبھی نہ کئے تھے۔ نوکری اُس کام کی جس کے واسطے عیش اور فرصت لازم ہے۔ دل و دماغ کا صحیح ہونا لابُد ہے اگر یہی حال رہا تو نوکری کہاں۔ مرحومہ زبان اُردو پر بہت قابض تھیں، اکثر محاوروں میں مجھ کو مدد ملتی تھی برخوردار لطیف احمد کا تعزیت نامہ بھی آیا اُس میں غزل کی بھی چھیڑ تھی اُس بچے کی فرمایش سے سخت پریشانی ہوئی آج یہ چند شعر کہے ہیں اُن میں سے منتخب کر کے دو چار شعر چھپوا دیجئے گا۔ ایک میں ایک مثل بندھ گئی ہے مگر مقدم موخر جملوں میں شبہ ہے گھر میں پوچھ کر لکھئے گا یا جس طرح آپ کو یاد ہو۔ گھر جانی میزبانی مجھ کو یاد ہے کاتب نے مقدم میزبانی لکھدیا ہو اُس پر میں نے م۔ خ بنا دی ہیں۔ کہئے منشی صاحب میری حیات کے جو نفس باقی ہیں کیونکہ گزر سکتے ہیں کوئی تدبیر تو بتائیے ؎

مل جائے کوئی عاشق دیرینہ تو پوچھوں　　کس طرح بسر کرتے ہیں ایّامِ جدائی

برخوردار محمد احمد کا خط بھی آیا، سیکڑوں خط چلے آتے ہیں میں گھلا جاتا ہوں سقوط اشتہا ہے بہت یاد کرو گے۔ بچوں کو دعا۔ احباب کو سلام پہونچے۔　　راقم فصیح الملک داغ دہلوی

۱۴ شعبان سنہ ۱۳۱۶ ہجری۔ وقت ۹ بجے شب۔ چہار شنبہ

حضرت سلامت۔ آپ کا عنایت نامہ مدّت کے بعد مدّت سے آیا ہوا ہے۔ جنرل مرحوم کا واقعہ واقعی حیرت افزا ہے میرے روزوں کا حال شب بیدار تہجد گزار خدا شناس جانتے ہیں۔ آپ نے تو نہ کبھی پڑھی نہ قضا کی۔ میں نے آسمان و زمین کے چودہ طبق ڈھونڈھے۔ امیر اللغات کا کہیں پتہ نہ لگا۔ اتنا سنا کہ مولوی سیف الحق صاحب ادیب نے ایک جلد منگوائی ہے میں نے مستعار طلب کی معلوم ہوا کہ مستعار گئی ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب الم نے گولکنڈہ سے آپ کو لکھا کہ دیلوپی لزبل بھیجدو اُس کا جواب اب تک نہ ملا، آج وہ شاکی تھے۔ امیر اللغات کے عیب و صواب کو دیکھنا میرا فرض منصبی ہے

شاید شاگردوں کو بھی اس کی خریداری کے واسطے لکھوں۔ اسی شہر میں چند نسخے آتے تو چرچا ہوتا۔ آپ نے کتنے چھپوائے کتنے بک گئے کتنے باقی ہیں۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا آپ کو خدا نے توفیق نہ دی برابر ہوئے کہیں نہ کہیں سے کوئی نسخہ دیکھنے کو آ ہی جائے گا مگر اب میرے نام نہ بھیجنا ورنہ میں واپس کر دوں گا۔ اعلیٰ حضرت حضور پُر نور کی نوکری بجا رہا ہوں۔ غزلیں اصلاح ہو رہی ہیں۔ فرمانِ سلطانی بوعدۂ پرورش بقلم خاص میرے نام صادر ہے۔ سنتا ہوں کہ حسب دستور جاگیر کی تجویز درپیش ہے اور یہی باعث تعویق کا ہے۔ الطاف خسروانی تحریری و زبانی بہت کچھ اُمید دلا رہے ہیں عمل خوانوں سے چارہ نہیں۔ حکم الٰہی کی دیر ہے۔ مگر تم عمل پڑھنا چھوڑو تو اجرائے کا۔ جلد ہو۔ آپ کے طرف دار ضیغم صاحب وغیرہ وغیرہ اہل لکھنؤ آپ کی تعریف میری ہجو چھاپ رہے ہیں۔ ایک گلدستہ جاری کیا ہے یقین کہ وہ آپ کے ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔

بر سرِ فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد۔ دیواروں پر انگاروں پر۔ اس زمین میں مجھ پر سخت فرمائش ہے۔ آتش کی غزل تو میں نے دیکھی کیا عجب اسیر مرحوم کی بھی غزل ہو۔ آپ کی بھی غزل ہو۔ سنتا ہوں کہ بہت اہل لکھنؤ کی غزلیں ہیں دو چار کی نقل بھجوا دو تو مہربانی ہوگی۔ دو غزلیں ملفوف حاضر ہیں۔ برخوردار محمد احمد کو دیدینا۔ زیادہ نیاز۔ بچوں کو دُعا۔

نواب خلد آشیاں کا اُردو کلام یعنی سب دیوان میں نے حضور میں نذر کر دئے۔ مدعا یہ تھا کہ آپ کی فضیلت ظاہر ہو۔ یہ کتابیں مجھ کو منگانی ہیں ان کی قیمت دریافت کر کے اطلاع دیجئے۔ لفظ چٹی بمعنی ڈنڈی یا دستک عین دلی کی زبان ہے آپ کو اس کی سند کہیں ملی یا نہیں۔ لفظ لیلوٹ جو لیکر نہ دے اس معنی میں آپ کو کہیں ملا۔ فقط۔ راقم فصیح للملک داغ

۶ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ ہجری۔ حیدر آباد دکن محبوب گنج

جناب منشی صاحب ارسطو تدبیر شاعری کی لکیر پر فقیر منشی امیر احمد صاحب امیر دام عنایتکم۔ اس اونچے کا لمبا چوڑا سلام قبول ہو۔ مہتاب داغ کی تاریخ کا ممنون ہوا۔ تخمجہ کا معترف شکر ہے سب سے پہلے آپ ہی نے حوصلہ نکالا۔ اگرچہ یہ دیوان بے حوصلہ ٹھہرا۔ یہ تخمجہ نہیں بلکہ تعمیہ اتحاد ہے۔

میں تحریر سخت کا جواب بہ نرمی لکھتا ہوں مگر اُلٹی شکایت سنتا ہوں یہ میرا مقدر۔ مجھ کو آپ کی استدعا کی کیا خبر سُنی سُنائی پر کیا وثوق آپ کا فایدہ ہو اور میرا کچھ نقصان نہ ہو۔ اس میں دریغ کرنا کسی کافر ہی کا کام ہوگا۔ کاش اس کا تذکرہ مجھ سے بھی آئے۔ جب سے شکار سے معاودت فرمائی ہے، شعر و سخن کی طرف مکمل متوجہ ہیں ہر روز لفافہ معہ غزل اصلاح کو آتا ہے مگر نوبت حضوری نہیں آتی۔ نواب عماد الملک سید حسین صاحب جو پرائیویٹ سیکریٹری ہیں وہ ہی تلاشِ وقت رہتے ہیں۔ انگریزی چٹھیوں کا جواب لکھنا اور بات ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری جانب خیال سلطانی یوماً فیوماً اچھا ہے۔ یہ فن تو مر چکا تھا اتنی قدر بھی غنیمت جانئے، اگر انصاف کرتے تو اہل حسد کو تاہ اندیش مجھ کو بخوبی یاد کرتے آج برخورداروں کی اور شاگردوں کی تاریخیں پہونچیں۔ سبحان اللہ کیا کیا تاریخ کہی ہے۔ میری طرف سے

دُعا سلام پہونچے۔ راقم آثم داغ دہلوی مہدی علی صاحب کو سلام پہونچے
۱۶ ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ

چند زمینوں میں تتمہ باقی ہے۔ مقدم الف میں اگر کوئی زمین نئے خیال میں آئے تو مصرعہ بھجوا دو بلکہ پانچ سات۔

مکرم و معظم۔ وعلیکم السلام۔ ہاں ہاں میں اپنے ہاتھوں کے قربان کہ صحیفۂ مینائی ہاتھ آیا، اشعار متفرق پہونچے۔ "جو بیٹھی آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی پل کی ہیں" یوں درست ہے یہ مصرعہ آپ نے غلط لکھوایا دونوں جگہ پلکیں لکھدیا ہے تبدیل الفاظ خیال کر کے لکھوں گا۔ بندہ پرور پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے یہ محاورہ میں نے باندھا آپ سے دادطلب ہوں یہ خیال تھا کہ میرا کوئی حریف پہلے ہی لے اُچکا ہو۔ میری نظر سے نہیں گزرا۔ چند شعر اور کہکر غزل گورکھپور بھیجدی ہے ملاحظہ ہوگی۔ جو قصاید اُستاد کے نئے دیوان میں چھپے ہیں وہ ایک شخص کے پاس یہاں بھی ہیں۔ آزاد نے بطور خود بعض جگہ بڑا تصرف کیا ہے میری کیا مجال کہ دخل دوں اور اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ یار ہم نوکر تو ہو گئے مگر دعا کرو کہ اجرا بھی جلد ہو سخت پریشان ہوں یہ ۳ برس آخر عمر کے بہت بے مزہ گزرے کہ مجھ کو عزیز تر تھے۔ انشاء اللہ جس وقت سند ہاتھ آئی نقل خدمت میں حاضر ہوگی۔ بچوں کی ناسازی سُنکر دعائے صحت کرتا ہوں خدا قبول کرے۔ جلد جلد کیفیت لکھتے رہئے۔

یہاں مفصلات اور صیغہ جات میں غریب الوطن کو نوکری ملنی عنقا صفت ہے۔ قطعی مبالغت ہے۔ آپ کے قصیدہ کی کیفیت بھی معلوم ہے۔ یہاں کے لوگ اہلِ ہند کے مٹانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ خدا نے حضور پر نور کو میرا قدردان بالذات کر دیا کہ تین برس کی جانفشانی اور دس ہزار کے خرچ کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی ہے خدا کرے کرشمہ بھی جلد ہو۔ آمین ثم آمین، نہایت مقروض ہو گیا ہوں دیکھئے کیا صرف پڑے۔ یہ نہیں معلوم کہ کس تاریخ سے دستخط ہوئے ہیں۔ میرے معاملہ میں اب صدر المہام بہادر تک کو دخل نہ رہا۔ یہ بھی یقین ہے کہ بعد نذر کے اور آمد و رفت دربار کے انشاء اللہ اور بھی فیض یاب ہوں گا۔ تمام ہندوستان سے مبارکباد چلی آتی ہے حالانکہ ابھی سررشتہ میں حکم بھی نہیں آیا۔ دوست کیا میرے دشمنوں کو بھی مبارک ہو، سنتا ہوں کہ منصب ہوا اتنا بڑا منصب یہ تائید الٰہی ہے منشی احمد حسن صاحب کی پچاس روپیہ پنشن مقرر ہوئی۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اگر زندگی مستعار باقی ہے کہ بہت کم رہ گئی ہے میں ضرور انشاء اللہ تعالیٰ رام پور کے علاوہ آپ سے ملوں گا۔ آپ کے توہمات نے مراد آباد نہ آنے دیا۔ میں اس سرکار کا چور باغی نہیں ہوں۔ میرا ٹلوہ سے لوٹ آنا پردیسیوں کے واسطے سند ہے۔ مہدی علی خاں کو سلام پہونچے۔ ہمارا دیوان نہ لکھوا دیا یہ شکایت ہے۔ برخورداروں کو دُعا کہئے۔ میری پیدائش ۱۲۴۶ھ ۱۴ ذی الحجہ ہے، مطابق ۱۸۳۱ء آپ اپنی ولادت کی تاریخ بھی لکھ بھیجئے کہ دیکھوں کس قدر تفاوت ہے۔ راقم داغ دہلوی۔ ۱۳۰۸ھ روز چہارشنبہ

سنتا ہوں کہ نیا دیوان آپ کا چھپا ہے۔ وہ کہاں ہے کیا قیمت ہے۔ ہماری تاریخ سے داغ لگتا اسواسطے اطلاع نہ کی۔ یہ باتیں دل پر نقش ہوتی جاتی ہیں۔

امیر کا خط داغ کے نام :-

۷ جولائی ۱۸۹۶ء روز یکشنبہ

مکرم قدیم۔ سلام مسنون۔ نوازش نامہ آیا، ممنون یاد آوری فرمایا، غزلیں بھی پہونچیں، دیگر اُن کی نسبت جو احکام آپ نے صادر کئے ہیں، وہ ایسے مجمل اور باہم متناقض ہیں کہ تعمیل کرنا بن نہیں پڑتا، پہلے تو آپ نے لکھا ہے کہ "ان غزلوں کی نقل وسیم کے پاس فوراً بھجوادیں"، پھر آپ لکھتے ہیں کہ "آپ کی کمیٹی اس کو انتخاب کرکے میرے پاس وہ انتخاب جلد تر بھیجدے"۔ ایک جگہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس میں رطب و یابس سبھی کچھ ہے اس کو آپ ملاحظہ کرکے اطلاع دیں"۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ "نہیں معلوم کون شعر لڑا، اطلاع ہو تو دور کر دیا جائے۔ اب میں حیران کہ بعینہ اُن غزلوں کی نقل وسیم کو بھیجدوں تو پھر انتخاب کا کیا فایدہ اور اگر انتخاب کرکے آپ کے پاس بھیجوں اور اُس کا جواب آپ کے بعد وسیم کو بھیجوں تو وسیم کے پاس جلد پہونچنا کیونکر ہو سکتا ہے۔ گلچین کا آخری پرچہ یہاں آچکا جو صفحہ ۶۴ تک چھپا ہے۔ اب تو تمھاری غزلیں آیندہ کسی پرچہ میں چھپیں گی، پھر کیا ضرورت ہے کہ وسیم کو بھیجنے میں جلدی کی جائے لہذا میں یہی شق اختیار کرتا ہوں کہ پہلے منتخب کرکے آپ کو بھیجوں اور جو شعر میرے نزدیک ہر طرح عیب سے پاک اور آپ کے رتبے پر پھبتے ہوئے ہیں اُن کو انتخاب میں لوں، اور جو شعر کہ اُن میں مضامین تو تازہ ہیں مگر نظر دقیق اُن کو کسی عیب سے پاک نہ دیکھے اُن کو انتخاب سے چھوڑ دوں اور کچھ اشارہ ان عیوب کا لکھ کر آپ کو مطلع کردوں۔ یہ مجھے یقین ہے کہ اتحاد قدیمانہ کی نظر سے آپ بُرا نہ مانیں گے اور بطور خود اُس کی اصلاح کرلیں گے، میری عادت ہے کہ کسی کا اچھا شعر جو اندک تصرف سے درست ہو سکے، بیدردی سے اُس پر چھری نہیں پھیرتا، اور آپ کی عادت مجھے معلوم ہے کہ بہ نظر استغنا ذرا سے شبہ میں شعر یا تو بنالیں یا کاٹ دیں۔ اکثر شعروں میں بنا دینا تو مجھ سے ہو سکتا ہے، مگر دو وجہوں سے میں اپنے بنانے پر اعتماد نہیں کرتا۔ ایک یہ کہ مہاجرت کو زمانہ دراز گزر گیا ہے خدا جانے زمانے کے انقلاب نے آپ کی طبیعت میں کیا انقلاب پیدا کئے ہوں، میرا دخل دینا اور تصرف کرنا مبادا گراں گزرے، تو اُدھر آپ کو رنج ہو اِدھر مجھے ملال ہو اور مفت کی بحث آپڑے، میں کہوں یوں چاہئے، آپ کہیں نہیں یوں درست ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شاید آپ جو تصرف کریں وہ اُس تصرف سے بہتر ہو جو میرے خیال میں آئے میں دو ایک جگہ اپنے خیال کے موافق نسخہ لکھدوں گا، آپ کو اختیار ہے چاہے وہی رکھئے گا چاہے اور طرح بنا لیجئے گا۔

نواب مرزا خاں صاحب اُس ملک میں رہ کر اور پورا وقت فرصت پاکر آپ کی مشق کو تو بہت ترقی ہوگی، مگر

اپنے کلام میں عیوب پر نظر کم جاتی ہے، اور آپ پر کیا موقوف ہے جو ایسی جگہ پہونچے گا، جہاں پر کہنے والا نہ ہو، جو کچھ کہے آپ ہی اُس کا دیکھنے والا ہو، سننے والے ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ اُن کے سامنے پڑھا جائے واہ واکریں اُس کو یہی دقت پیش آئے گی، بلکہ آفریں ہے آپ کے حُسنِ طبیعت کو کہ باوصف تنہائی بہت سے محاسن آپ کے کلام میں رہتے ہیں اور بہت ہی کم معائب ہوتے ہیں۔

ان غزلوں میں البتہ خدا جانے زیادہ کد کی گئی یا اور کوئی سبب ہوا کہ کئی شعر معیوب نظر آئے، کئی شعر بے معنی معلوم ہوئے، بہرکیف طبیعت ایک رنگ پر رہتی نہیں، اس میں آپ کا کیا قصور، میں چونکہ آپ کا خیر خواہِ قدیم ہوں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ عیب دیکھوں اور آپ کو مطلع نہ کروں خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ مجھے دیکھنے اور انتخاب کرنے اور چھپوا دینے کے واسطے بھیجیں۔ اب اس خط کو درخواست عفو گستاخی و بے تکلفی پر ختم کرتا ہوں۔

تسلیم یہاں ہیں عند الملاقات آپ کا سلام کہوں گا۔ اپنے تو تالیف دونوں رسالے مدت ہوئی آپ کو بھیج چکا، خدا جانے کیا ماجرا ہے کہ پہلی بار امیر اللغات بھیجا وہ نہ پہونچا، ابکی بار یہ دونوں رسالے تلف ہو گئے۔ اب بذریعہ رجسٹری روانہ کرونگا۔

محمد احمد مع اخوان اور جلیل و آہ جنھوں نے اپنا تخلص بدل کر آہ کی جگہ اب دوست تخلص قرار دیا ہے اس لئے کہ آہ ایک بدنمیں لفظ ہے اور ان کے علاوہ سب عزیز واجبات مادجب گزار ہیں۔ گھڑی عطا ہونے کی مبارکباد دیتا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں ترقیات روز افزوں عطا فرمائے اور اُس سرکار فیض آثار کو دیر گاہ قایم رکھے اور امیر اللغات کی طرف متوجہ کرے۔ فقط

امیر احمد عفی عنہ

غزل نمبر ۱:۔ شعر ۴۔ نقشِ محفل اجنبی ہے، نہ اس کا استعمال فارسی میں نظر سے گزرا نہ اُردو میں۔ اور باعث ہونے کا یہ مقام نہیں ہے۔ دوسرے مصرع کی ترکیب یوں ہونا چاہئے کہ "جمنے میں یہ ہے اُڑنے میں یہ ہے"۔

۱۰۔ بھاگا کیا۔ ہے کو نہیں چاہتا، بلکہ "بھاگتا ہے" ہو تو ردیف ٹھیک اُترے۔

۱۵۔ ایک چیز کی نسبت کہتے ہیں، جب وہ دونوں کام دے، مثلاً تلوار کی تلوار ہے اور عصا کا عصا ہے، شاید آپ کے یہاں اس صورت سے محاورہ ہو تو اُس صورت میں مجھے کچھ تامل نہیں ہے، مگر میرے نزدیک جگہ اس کی ہے کہ یہی ہمارا رستہ ہے یہی ہماری منزل ہے اور شوق کی جگہ درد مناسب ہے۔

۱۸۔ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

۱۹۔ قسم مشکل کشا کی بھرتی ہے، یہ ترکیب۔ یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے، قسم کو نہیں چاہتی۔

غزل نمبر ۲:۔ ۱۔ عجب اس میں ذرا بے محل معلوم ہوتا ہے، کیا قرینے سے محفل آراستہ ہے، یا عجب آراستہ محفل ہونا چاہئے۔

۷۔ جس چیز کا دھوکا ہو اس کا بیان دھوکے کے ساتھ ہوتا ہے، اصل چیز بیان میں نہیں آتی، دل ایسا کہ مجھے دھوکا ہوا پہلو میں تکیہ ہے، اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ چاہے یوں بنا لیجئے۔ نہیں کھلتا کہ پہلو میں مرے تکیہ ہے یا دل ہے، یا

اور جو صورت آپ کے خیال میں آئے۔

۹ - آپ کا مقصود غالباً یہ ہے کہ دوست کا قاتل ہے اور دوست کے دشمن کا بسمل ہے، مگر پیدا یہ ہوتا ہے کہ "اپنے دوست کا قاتل ہے، اپنے دشمن کا بسمل ہے۔

۱۲ - رشک نے مارا کے ساتھ کیوں کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا، یوں چاہئے "مجھے اس رشک نے مارا کہ وہ عالم کا قاتل ہے"۔

۱۹- میرے نزدیک شامل کی جگہ شریک چاہئے۔ شاید دلی میں اس جگہ شامل بولتے ہوں، اگر ایسا ہو تو رہنے دیجئے۔

غزل نمبر ۱۳:- ۳ - یا تو بھی نہ ہو یا دوسرا نہ ہو (یہ اشارہ[1] کس طرف ہے میں نہیں سمجھا)

۵ - اس کا مغز میری سمجھ میں صاف نہ آیا حاصل کیا ہوا۔

۹ - دوسرے مصرع میں کہ بہت بے محل ہے چاہئے یوں بنا لیجئے، چرانا اپنے دم کا بھی وہاں چوری میں داخل ہے۔

۱۰ - دُھن بندھنا اس جگہ مناسب نہیں ہے۔

۱۶ - دوسرے مصرع میں ورنہ غش میں غافل ہے، کی جگہ ورنہ غش ہے سے مطلب حاصل ہے۔ غافل ہے کی ضرورت نہیں قافیہ بیکار ہے۔ فقط

مکرما - مطالب کے لکھنے میں آپ کی غزل کی تعریف لکھنے سے رہ گئی، اب لکھتا ہوں کہ جن شعروں کو میں نے منتخب کیا ہے، ان کا مزا میرا ہی جی جانتا ہے، خصوصاً یہ شعر:-

بڑھا دیتا ہے کیا کیا طالب دیدار ہو ہو کر — مرے پاس نگہ پر بھی گمان دوست سائل ہے

باعتبار تازگی مضمون کے بمثیل ہے، خداوند تعالیٰ سرزمین سخن کو آپ کی ذات سے سرسبز و شاداب رکھے۔ فقط۔

بندہ نواز - آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ اس کا جواب جو آئے گا وہ ملاحظہ سے انشاء اللہ ضرور گزریگا، اس لئے مجھے مناسب معلوم ہوا کہ میں حضور میں پیش کرنے کے قابل دوسرا خط بھیجوں، اس لئے کہ یہ خط تو بہ نظر اپنی اور آپ کی بے تکلفی کے میں نے لکھا ہے۔ دوسرے خط کو اگر آپ پیش کیجئے گا تو امید ہے کہ لغت والا مضمون بھی ملاحظہ بندگانِ اقدس سے گزر جائے۔

شاید کہ ہمیں بیضہ برآرد پر و بال عنقا گردد!

داغ کا خط امیر کے نام:-

جناب مکرم - وعلیکم السلام - نیاز نامہ کا جواب اس توجہ اور عنایت و عرق ریزی سے آپ نے لکھا کہ میں پانی پانی ہو گیا - بارے آپ کے دل میں محبت قدیم کا لگاؤ ابھی ہے، اللّٰھمَ زِدْ - میں نے یہ غزلیں مجبوراً ڈھائی گھنٹے میں کہیں - ڈیڑھ گھنٹے میں دو غزلیں، اور ایک گھنٹہ میں ایک غزل - منشی فرید الدین صاحب ملازم سرکار گھڑی رکھ کر

---

[1] یہ نوٹ داغ کے قلم کا ہے۔

اشعار لکھتے جاتے تھے، خدا جانے یہ کیا امتحان تھا اور کیوں تھا۔ آپ کے انتخاب سے میں خوش نہ ہوا۔ بہ سبب مہاجرت کے مذاق میں مغائرت ہوگئی، آپ کے شبہات پر میں نے غور کرکے، بجا اور بیجا کا لحاظ رکھکر، ملفوف رقیمۂ نیاز کیا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مکرر ملاحظہ فرماکر جواب جلد لکھئے۔ فقط نقشِ محفل واقعی اجنبی ہے، پہلے میں نے یہی لکھا تھا اُس کے بعد لفظ حسن بنایا تھا، مگر نقل میں پہلا ہی مصرع آپ کی خدمت میں پہونچا، یہ محض تائید الٰہی تھی کہ ایسے جنگل جھاڑی گرمی۔ نوکری میں اتنے جلدی ایسے شعر موزوں ہوگئے، وہ بھی آپ کے گلدستہ سے علٰحدہ کرکے لکھے گئے اور ہاتھوں ہاتھ حضور میں پہونچتے رہے۔ اس شکار میں گویا ٹیلی گراف پر شاعری ہوئی ہے ورنہ شیر کے شکار میں شعر سے کیا بحث۔ اس زمانہ میں اکثر گلدستہ نکلے ہیں، تمام ہندوستان کی شاعری معلوم ہوتی جاتی ہے، خوشی سے زیادہ افسوس ہوتا ہے، میں نے بیگانہ وار ہوکر اپنی غزل پر صاد کردئے ہیں، اُن پر پھر نظر توجہ سے ملاحظہ کیجئے، چونکہ اس کی نقل سرکار عالی میں پہونچ گئی ہے، زیادہ تصرف میں مناسب نہیں جانتا، یقین ہے اس نکتہ کو آپ بھی پسند کریں گے۔ الحمدللہ کہ جدت مضامین و لطف زبان سے خالی نہیں ہے، یہ آپ کا ارشاد بہت بجا ہے کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا نظر نہیں آتا، مگر یہ بھی خیال رہے کہ جو ذریات لکھنؤ کی یہاں جمع ہیں مجھ پر چھری تیز کئے ہوئے ہیں، یہیں پر کیا منحصر ہے تمام ہندوستان مخالف ہے، سنتا ہوں کہ آزاد لکھنوی اور شحنۂ ہند میرٹھ اڈیٹر یا مالک مجھ پر یا میرے شاگردوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں، لوگ بغیر میری اطلاع جواب بھی دے رہے ہیں اعتراض بھی لغو اور جواب بھی پوچ۔ یہ اُمور خلل انداز روزگار اور مانع اعتبار نہیں ہوسکتے۔ نہ ایسے حاسد فروغ پاسکتے ہیں۔ داغ کا سکہ جس کے دل پر بیٹھا وہ مٹ نہیں سکتا۔ آپ یہ جانتے ہوں گے کہ داغ کی مشق بڑھی ہوئی ہے۔ مہتاب کو چھپے دو برس کا زمانہ گزرا۔ اس دو برس میں بیس غزلیں کہی ہیں۔ کیا اس کا نام مشق ہے ہر مہینے میں دو چار نئے خط باستدعائے شاگردی آتے رہتے ہیں۔ دو ھائی دیتا ہوں کہ مجھے فرصت نہیں، صحت نہیں۔ نوکر ہوں آزاد نہیں۔ مصنف امیر اللغات کے پاس کلام بھجواؤ، وہ اُستاد مسلم الثبوت ہیں۔ کوئی کمبخت نہیں سنتا۔ غزلوں سے قصیدوں کا نمبر بڑھا، قصیدوں سے دیوان کا نمبر آیا اب دیوان کے دیوان چلے آتے ہیں چھ مہینے کے سفر میں تین سو غزلیں میں نے بناکر بھیجی ہیں، ہزار آٹھ سو اس وقت باقی ہیں، اگر آپ کو فرصت ہو تو بھیجدوں۔ مگر آپ کے پاس کیا اس سے کم ہوں گی، آپ کی نازک دماغی کب متحمل ہوسکتی ہے۔ آپ نے جو خط جداگانہ بھیجا اس میں جو تعداد زر لکھی ہے، وہ نہایت نامناسب ہے۔ نواب خلد آشیاں کی کیفیت جو مفصل ارقام فرمائی ہے وہ حاوی ہے سب اُمور پر اور کافی ہے مدعائے خاص کے لئے مجھے نوکر ہوئے ساتواں برس ہے۔ عند الطلب کبھی کبھی حضوری نصیب ہوئی تھی۔ اس شکار میں شب و روز حاضر رہنے کا اتفاق ہوا، تو اپنے ذہن کے موافق کچھ کچھ مزاج کے رنگ سے آگاہی ہوئی، وہ گہرا دریا ہے کہ تھاہ نہیں، قیاس کام نہیں کرتا۔ آپ جب میری غزل

مکرر نقطۂ انتخاب کر کے بھیجیں گے تو اُس غزل کے ساتھ آپ کی تحریر بھی انشاء اللہ تعالیٰ ضرور پیش ہوگی کہ اُس انتخاب کا انتظار ہے، کئی بار خان علی صاحب آکر تقاضا کر چکے ہیں، اسی لحاظ سے آپ کے ذخیرہ کو واپس کرتا ہوں کہ مکرر سوچ سمجھ کر بھجوائیے۔

حضرت بندگان عالی متعالی دام اقبالہ، کو اپنے ملازم کے اعزاز کا نہایت پاس ہے۔ داغ ناچیز کا جو اعزاز بعنایت الٰہی یہاں ہوا کسی پردیسی کو کہاں نصیب، اکثر اُمراء اور رؤسا ملکی بھی ہنوز محروم ہیں۔ ادنیٰ خطاب خان بہادر اس کے بعد جنگ اُس کے بعد دولہ اُس کے بعد ملک۔ ملک سے اعلیٰ تر ملازم کے لئے کوئی خطاب نہیں ہے چنانچہ سرور جنگ، محبوب جنگ، افسر جنگ وغیرہ وغیرہ ابھی جنگ سے آگے نہیں بڑھے۔ اور بہت لوگ سو سو برس سے اس تمنا میں ہیں، بلکہ مر گئے۔ مجھ کو خداوند عالم نے ایک ہی بار سب خطابوں سے سرفراز فرمایا۔ خطاب کے لحاظ سے کم و بیش اعزاز میں ضرور فرق ہوتا ہے، خصوصاً دربار کے موقع پر مغلی دربار میں سالہائے دراز سے آج تک بجز آٹھ نو سرداروں کے، یعنی خاندان امیر کبیر، مدار المہام و پیشکار خانخاناں ان کے سوائے کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ بڑے بڑے راجہ، بڑے بڑے نواب دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ مجھ کو ایسے دربار میں بھی بیٹھنے کی اجازت ہوئی جو محسود عالم ہونے کا باعث ہوا۔ جس کو جنگ کا خطاب بھی ہوتا ہے، ضرور ہے کہ اُس کے خطاب کے ساتھ لفظ نواب و بہادر لکھا جائے۔ دولہ اور ملک کا رتبہ تو بڑا ہے۔ علاوہ منصب جلیلہ اُستادی کے اب میں اسٹاف خاص میں بھی داخل ہوا اس کی تنخواہ دو ہزار روپے سے کم نہیں ہوتی، لوگ مبارکباد دے رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ملا ہے، یہی میری لیاقت سے زیادہ ہے، مجھ میں تو دس روپے ماہوار کی بھی لیاقت نہیں، اس تحریر سے مراد یہ ہے کہ سرکاری ملازم، خطاب یافتہ کو آپ اپنی تحریروں میں یہاں کے دستور کے موافق لکھا کریں، ورد سرنامہ دیکھ کر باعثِ کبیدگی و آشفتگی سرکار ہوگا۔ اعلحضرت کو ان باتوں کا بہت خیال ہے، مکرر یہ کہ آپ نازک مزاج بہت ہیں اور با وصف نحیف الجثہ ہونے کے، خم ٹھونک کر لڑنے کو طیار رہیں۔

یہ نہ جانئے گا کہ داغ نے میری ہدایتوں سے بُرا مانا اور میرے شبہات کا غیر واجب جواب لکھا، میں نہایت ممنون ہوا، آج دونوں کتابیں دفتر امیر اللغات سے میرے پاس پہونچیں۔ کل سے انشاء اللہ دیکھنا شروع کرونگا۔ مجھ کو یہ فکر ہے کہ آپ کو میرے بخشوانے کا اتنا کیوں خیال ہے۔ بچوں کو دعا، دوستوں کو سلام پہونچے۔ آج اتوار کا دن ہے، رجسٹری نہیں ہو سکتی، کل انشاء اللہ ضرور روانہ کروں گا۔

راقم آثم فصیح الملک داغ دہلوی
مرقومہ ۱۱ محرم شریف ۱۳۱۲ھ یکشنبہ

واقعی نقشِ محفل اجنبی ہے، میں نے اول یہی کہا تھا، اُس کے بعد لفظ حُسن بنایا تھا، پہلا ہی مصرع لکھا گیا۔ جب ڈھائی گھنٹہ میں اس قدر شعر کہے جائیں تو کیا ہو، خصوصاً شیر کے شکار میں شعر سے کیا واسطہ۔

لفظ باعث مجھ کو نہیں کھٹکتا تھا ؎

تمھاری بزم میں ہر بات کا باعث مرا دل ہے جمے تو رنگ محفل ہے، اُڑے تو حُسن محفل ہے

اس مصرع میں "تو" کا اشباع ہوا ہے، ورنہ یونہی یہ مصرع ہو سکتا تھا۔ میری رائے ناقص میں ترکیب پہلے ہی مصرع کی اچھی ہے

یہ جم کر رنگ محفل ہے یہ اُڑ کر حُسن محفل ہے

مکرر اپنی رائے سے اطلاع دیجئے ورنہ میں کاٹ دوں گا ہر چند کہ سرکار میں نقل غزل کی پہونچ گئی ہے۔

مقام امن سایہ ہے مرے بھاگا کیا کوسوں کہ پیچھے پیچھے میں ہوں، میرے آگے آگے منزل ہے

یہ حادی دونوں زبانوں پر، یعنی یہ حال تھا اور ہے ـــــ فریاد فریاد کہ ایسا شعر ناپسند ہو۔

اوٹھایا شوق نے اوٹھے، بٹھایا ضعف نے بیٹھے یہی رستہ کا رستہ ہے یہی منزل کی منزل ہے

جو آپ چاہتے ہیں وہ خاص اس ترکیب میں پیدا ہے، بلکہ یہی محاورہ ہم لوگوں کا اور یہی مدعا ہے۔ داد بیداد کہ یہ شعر بھی معیوب ہو۔

قسم مشکل کشا کی یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے

واللہ یہ ترکیب قسم کو ضرور چاہتی ہے۔ داغ گھبرا رہا ہے، تسلی دینے والا قسم کھا کر یقین دلاتا ہے کہ یہ کیا مشکل ہے، اب آسان ہو جائے گی، عین زبان ہے، ہائے افسوس کہ آپ مجھ سے دور ہو گئے اور کوئی دلی والا لائق آپ کے پاس نہیں۔

یہ اے صیاد اک پہلو نکل آیا رہائی کا اسیروں میں ترے جو چھوٹ جائے وہ مرا دل ہے

جی چھوٹ جانا، دل چھوٹ جانا، دونوں میری زبان پر ہیں، اب تو خیال فرمائیے کہ یہ شعر کیسا ہے۔

قرینے سے عجب آراستہ قاتل کی محفل ہے

یہاں عجب کیوں برا ہوا۔ قرینہ سے جملہ الگ ہے، عجب آراستہ دوسری صنعت ہے۔ واے تقدیر کہ یہ شعر تین صادوں سے محروم رہے۔

بڑھا دل اس قدر فرط خوشی سے وصل کی شب کو مجھے دھوکا ہوا پہلو میں، یہ تکیہ ہے یا دل ہے

آپ کا لکھنا تو ہر طرح سے ہدایتاً اور دوستانہ ہے، مگر میں نے خوب فکر و غور کی، تو اس کا عیب سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اس دھوکے میں شک میں رہا کہ یا اب یہ تکیہ ہے پہلو میں یا دل ہے۔ چونکہ پہلے دل کا ذکر آچکا ہے۔ اُسکا اعلان "یا" کے ساتھ ضروری تھا، آپ کا مصرع بھی بہت خوب ہے۔ مگر جب عیب کو نہ سمجھوں تو سرکار میں بھیجی ہوئی غزل کا مصرع کیوں بدلوں۔ یہ بھی تقدیر کہ اس تازہ مضمون کا میں داد طلب تھا اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔

یہ نیرنگ محبت کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ جو اپنے دوست کا قاتل ہے، وہ دشمن کا بسمل ہے، میں نے اسکے معنی یہی رکھے ہیں کہ معشوق اپنے دوست کا قاتل اور اپنے دشمن کا بسمل ہے، یعنی جس کو وہ دوست اپنا جانتا

ہے اور اُس پر مایل ہے وہ فی الحقیقت اس کا دشمن ہے۔ میرے خیال میں۔

ستم بھی ہو تو مجھ پر ہو، جفا بھی ہو تو مجھ پر ہو مجھے اس رشک نے مارا وہ کیوں عالم کا قاتل ہے

منشی امیر احمد صاحب میرے ہوتے جلال پر کیوں عنایت فرماتے ہیں، مجھے تو یہ رشک مارے ڈالتا ہے۔ اس رشک نے مارا کیا یہ خلاف محاورہ ہے۔ لفظ "کیوں" میری رائے میں اُچکا ہوا ہے۔

سُنا بھی تو نے اے دل کیا صدا آتی ہے محشر میں یہی دن امتحاں کا ہے ہمارے کون شامل ہے

اہلِ دہلی کی زبان پر شامل شریک کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بُرے وقت میں کون کسی کا شریک ہوتا ہے۔ بُرے وقت میں کون کس کے شامل ہوتا ہے۔

شہادت میری فریادوں کی اس سے بڑھ کے کیا ہوگی فرشتے لکھتے ہیں بیٹھی ہوئی آواز سایل ہے

معشوق کی فریادوں کا یقین نہیں آتا، حالانکہ درج نامۂ اعمال ہو رہا ہے، آواز بیٹھنے کی یہ بڑی شہادت ہے، یہاں مُراد فریادِ سایلِ وصل سے ہے، نہ بھیک مانگنے والے سے۔ کیا یہ شعر بُرا ہے، بے معنی تصور فرمایا۔ براہ مہربانی مطلع فرمایئے گا۔ میں اس کو بہت اچھا سمجھے ہوا ہوں۔

یہ کیوں تیغ ادا سے مضطرب مانند بسمل ہے الٰہی کیا کلیجے کے بھی اندر دوسرا دل ہے

اس کو یوں سمجھئے۔ دوسرا دل کیا کلیجے کے اندر بھی ہے، میں نہیں سمجھا کہ اس میں کیا قباحت ہے۔ یہ باتیں تو جب طے ہوں کہ صحبت میسر آئے۔ تحریر سے یہ شبہات مٹ نہیں سکتے۔ میری رائے میں شعر بہت اچھا ہے اور نیا پہلو ہے

ستم دیکھو وہ مشکیں باندھتے ہیں اپنے بسمل کی کہ اپنا دم چرانا بھی وہاں چوری میں داخل ہے

کاف علت کا یہاں بے محل مجھ کو نہیں معلوم ہوتا، عین زبان کے محاورہ میں ڈھلا ہوا ہے۔ آپ کا مصرع بھی خوب ہے، مگر دم کے چُرانے سے دم چُرانا فصیح تر معلوم ہوتا ہے۔ انصاف تو کرو کیا شعر کہا ہے:۔

کیا دیوانگی میں قید، جب سے چارہ سازوں نے مجھے یہ دُھن بندھی ہے، میرے پھندے میں سلاسل ہے

لفظ دُھن خاص اپنے محل پر بندھا ہے۔ خدا جانے آپ کس وجہ سے بے محل سمجھے۔ میں اس کو بے محل نہیں سمجھتا۔

یقیں آتا نہیں اُس بدگماں کو رگِ عاشق کا کوئی مر جائے تو سکتا ہے، ورنہ غش ہے غافل ہے

غش میں غلط لکھا گیا۔ میں۔ کی جگہ ہے۔ تصور کیجئے۔

(فاران)

قولِ فیصل جس میں ملک کے مشہور و مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدر آبادی نے جوش کی مشہور نظم "حرفِ آخر" کو سامنے رکھکر اس کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسکو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ ۲۰ پونڈ دیدہ زیب گرد پوش رنگین قیمت دو روپیہ

مالہ وما علیہ

(سیماب، آرزو، اثر، وحشت، نوح، مانی، روش، ماہر)

حال ہی میں ماہنامہ شاعر، آگرہ کا مشاعرہ نمبر کتابی سائز پر شایع ہوا ہے جو ۱۶۰ صفحات کو محیط ہے۔ مصرع طرح جس پر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے، یہ تھا:۔

"انھیں اندھیروں سے بزمِ گیتی کو ایک دن روشنی ملیگی"

ایک ہی طرح پر مشاعرہ میں غزلیں پڑھنا کچھ عرصہ سے متروک ہو چکا ہے اور شعراء اپنی کوئی پرانی غزل یا نظم جس پر انھیں کافی داد مل چکی ہوتی ہے، پڑھ دینا کافی سمجھتے ہیں، حالانکہ فنی حیثیت سے طرح پر غزل کہکر پڑھنا زیادہ مناسب و مفید ہے۔

ماہنامہ شاعر نے یہ خاص نمبر نکال کر پھر اس بھولی ہوئی یاد کو تازہ کیا ہے اور شعر و سخن کی صحیح خدمت انجام دی ہے۔

مشاعرہ نمبر میں ۱۲۶ شعراء نے شرکت کی ہے جن میں چھوٹے بڑے، نئے پرانے سبھی شامل ہیں۔ جن شعراء نے غزلیں نظم کے رنگ کی کہی ہیں، ان کو ترتیب کے وقت علٰحدہ کر دیا گیا ہے۔ ایسے شعراء کی فہرست میں چار کا نام نظر آتا ہے جن میں جوش بھی شامل ہیں۔ جناب اثر لکھنوی کا نام اس فہرست میں نہیں ہے، حالانکہ انکی غزل بھی دراصل نظم ہی ہے۔

فہرست میں، قدر اول کے صرف چند شعراء کے نام نظر آتے ہیں، جن میں سیماب، آرزو، اثر، وحشت، نوح، مانی، روش اور ماہر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

سیماب اکبرآبادی

سب سے پہلے جناب سیماب کی غزل درج کی گئی ہے، جس کا کوئی شعر ایسا نہیں جو نقص سے خالی ہو۔ مفہوم کے لحاظ سے ان کے یہ دو شعر بہت اچھے ہیں۔

نہ بھول اے تارکِ محبت کہ ترکِ اُلفت بھی اک خلش ہے
جو پھانس تو نے نکال دی ہے، وہ پھانس دل میں لگی رہے گی

کہاں ہے سیماب کا وہ دل اب جو اس کی پہلو میں جستجو کی
گھٹا ہوا سا دھواں ملیگا، اڑی ہوئی خاک سی ملے گی

لیکن افسوس ہے کہ یہ دونوں شعر بھی نقص سے خالی نہیں۔ پہلے شعر میں تارکِ محبت، غزل کی زبان نہیں اور وہ پھانس کی جگہ وہی پھانس ہونا چاہئے۔

دوسرے شعر کے دونوں مصرعے ایک دوسرے سے مربوط نہیں۔ شعر سے کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ "گھٹا ہوا سا دھواں" کہاں اور "اڑی ہوئی خاک" کہاں ملے گی۔ پہلے مصرعہ میں اس کو اس طرح ظاہر کیا جا سکتا تھا:۔

عبث ہے سیماب جستجو سب، کہ دل جہاں تھا وہاں تمھیں اب

مطلع ہے:۔

فسردگی کی تہوں میں باقی حرارتِ زندگی ملے گی
نگاہ نے دور تک کریدا تو آگ دل میں دبی ملے گی

پہلے مصرعہ میں لفظ باقی بالکل بیکار ہے، اس کے استعمال کی کوئی ضرورت نہ تھی اگر باقی کی جگہ "اب بھی" ہوتا، تو یہ نقص نہ رہتا اور زورِ بیان بھی پیدا ہو جاتا۔

دوسرا مطلع ہے:۔

بہت منظم ہے بزمِ عالم یہاں مساوات ہی ملے گی
جو شام تک روشنی ملی ہے تو صبح تک تیرگی ملے گی

پہلے مصرعہ میں لفظ مساوات کا استعمال صحیح نہیں، رات دن میں تضاد ہے نہ کہ مساوات۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیماب صاحب نے یہ لفظ باقاعدگی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ مصرعہ ان کو یوں لکھنا چاہئے تھا:۔

بہت منظم ہے بزمِ عالم، تضاد کی حد بھی ہے مقرر

تیسرا شعر ہے:۔

جو تجھ کو منزل پہ ہے پہونچنا تو چل مرے نقشِ رہروی پر
میں جس فضا سے گزر رہا ہوں فضا تجھے بھی وہی ملے گی

دوسرے مصرعہ میں۔ "گزر رہا ہوں"۔ ظاہر کرتا ہے کہ شاعر ابھی تک منزل پر نہیں پہونچا، اس لئے اس کا یہ کہنا کہ "تجھ کو منزل پر پہونچنا ہے تو میرے نقشِ رہروی پر چل" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ کہنا اسی وقت مناسب تھا جب منزل تک رسائی ہو چکی ہوتی۔ علاوہ اس کے "نقشِ رہروی" بھی کوئی اچھی ترکیب نہیں۔ میری رائے میں اس شعر کو یوں ہونا چاہئے:۔

جو تم کو منزل پہ ہے پہونچنا تو میرے نقشِ قدم کو ڈھونڈھو
میں جس فضا تک پہونچ چکا ہوں فضا تمھیں بھی وہی ملے گی

چوتھا شعر ہے:-

جگر تاروں کی تیرگی میں، فشارِ ذروں کی روشنی میں
الٰہی اس حشرِ زندگی میں کسی کو تسکین بھی ملے گی

تاروں میں تیرگی ہوتی ہے، نہ ذروں میں بالطبع روشنی۔ ذروں میں روشنی سورج کے انعکاس سے پیدا ہوتی ہے علاوہ اس کے فشار کی کیفیت تاروں میں تو پائی جاتی ہے، لیکن ذروں میں نہیں، اسی طرح جگر (اگر یہ کوئی صحیح لفظ ہے) کا تعلق ذروں سے ہو سکتا ہے، تاروں سے نہیں۔ اس لئے پہلا مصرع یوں ہونا چاہئے۔

فشارِ تاروں کی روشنی میں جگر ذروں کی تیرگی میں گو یہ اعتراض پھر بھی باقی رہتا کہ جگر تسکین کی منافی نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ حشر بھی بیکار ہے۔

پانچواں شعر ہے:-

حیاتِ تازہ پہ مرنے والے، حیاتِ تازہ ہے موت ہی سی
یہ زندگی پہلے ختم کر لے تو پھر نئی زندگی ملے گی

نئی زندگی اور حیاتِ تازہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے حیاتِ تازہ ختم کرنے کے بعد جو نئی زندگی ملے گی تو وہ بھی حیاتِ تازہ کی طرح "موت ہی سی" ہوگی، پھر دونوں میں فرق کیا ہوا۔ دوسرے مصرعہ میں نئی زندگی کی جگہ اصلی یا حقیقی زندگی کہنے کا موقعہ تھا۔

چھٹا شعر:- سکون کہتی ہے جس کو دنیا، سکوت میں ہے نہ گفتگو میں
کلی کہ ہے کہ اک سکوتِ مطلق، سکوں سے دامن تہی ملے گی

پہلے مصرعہ میں دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ "سکون نہ سکوت میں ہے نہ گفتگو میں"۔ دوسرے مصرعہ میں بہ حالتِ سکوت، سکون میسر نہ آنے کی صورت تو بتا دی گئی، لیکن گفتگو کی حالت میں عدمِ سکون کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ علاوہ اس کے کلی کو سکوتِ مطلق کہنا بھی صحیح نہیں۔ سکوتِ مطلق کے معنی سکوتِ محض کے ہیں جس کا تعلق مادی اشیاء سے نہیں۔ اس لئے کلی کو سکوتِ مجسم تو کہہ سکتے ہیں، لیکن سکوتِ مطلق نہیں۔ سکوتِ مطلق کی جگہ سکونِ کثیر (بلا اضافت نون) بھی کہہ سکتے تھے۔ دوسرے مصرعہ کے پیشِ نظر، پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے:-

سکون کہتی ہے جس کو دنیا، سکوت میں بھی نہیں میسر

تاکہ گفتگو کی حالت میں سکون میسر نہ آنے کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

دوسرے مصرعہ میں دامن تہی کی ترکیب غلط ہے۔ صحیح ترکیب تہی دامن ہے۔

ساتواں شعر ہے:۔

سجودِ آدم کی عظمتوں پر کرے گا جب غور نفسِ خودسر
تو آدمیت کی رفعتوں پر حقیقتِ آدمی ملے گی

اس شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ اگر سجودِ آدم سے مراد وہ سجدہ ہے جو فرشتوں نے آدم کو کیا تھا، تو "نفسِ خودسر" سے خطاب کا کوئی موقعہ نہیں اور اگر اس سے مراد خود آدم کا سجدہ کرنا ہے تو پھر دوسرے مصرعہ میں رفعتوں کا ذکر بے محل ہے

حضرت سیماب جو مفہوم اس شعر سے واضح کرنا چاہتے ہیں غالباً یہ ہے کہ "فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کی حقیقت بہت بلند ہے اور یہی حقیقت انسان کے پیش نظر رہنا چاہئے" لیکن وہ اس مفہوم کو ادا نہ کر سکے۔

اگر کچھ رد و بدل کر کے شعر یوں پڑھا جائے تو یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے:۔

سجودِ آدم کے واقعہ سے یہ درس ملتا ہے آدمی کو
کہ خود شناسی کے بعد ہی کچھ حقیقتِ آدمی ملے گی

نواں شعر:۔

ذرا سی خاطر شکستگی کی نہیں ہے برداشت آدمی کو
کلی کو وقتِ شکست دیکھو تو مسکراتی ہوئی ملے گی

دوسرے مصرعہ میں لفظ شکست غلط ہے۔ کھلنے کے مفہوم میں شکست کبھی نہیں استعمال ہوتا۔ فارسی میں غنچہ شکستن کلی توڑنے کے معنے میں مستعمل ہے۔ سالک یزدی کا شعر ہے:۔

بپائے اہلِ محبت چرا خلد خارے
نہ غنچہ بشکستند و لے گلے خستند

کھلنے کے معنی میں شکست کا استعمال صحیح نہیں۔

آرزو لکھنوی

آرزو لکھنوی نے زبان و خیال دونوں حیثیتوں سے اپنے معمول سے ہٹ کر غزل کہی ہے، اسلئے تغزل کم اور اعتبار و بصیرت زیادہ ہے۔

جناب آرزو بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور ہمیشہ بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں، اس لئے ان کی غزل میں کوئی فنی یا لسانی غلطی نہیں پائی جاتی۔ صرف ایک شعر میں تھوڑے سے تصرف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شعر یہ ہے:۔

کمر کو کس لے تو منتظر بن، کہ ہو گی جس دم طلب اچانک
نہ وقفہ اک سانس کا ملے گا، نہ فرصت اک بات کی ملے گی

پہلے مصرعہ میں بن کی جگہ رہ ہونا چاہئے۔ محاورہ منتظر بننا نہیں بلکہ منتظر رہنا یا منتظر ہونا ہے۔

ان کا ایک اور شعر ہے :-

ظہور و غیبت ہیں ایک دونوں کمالِ جذبِ دلی کے آگے
نظر سے اوجھل ہوا جو سورج تو چاند سے روشنی ملے گی

غیبت کا غزل کی زبان نہیں۔ علاوہ اس کے شعر کے مفہوم میں کچھ جھول ہے اگر سورج کے غائب ہو جانے کے بعد چاند سے روشنی ملنے لگتی ہے تو اس کو جذبِ دلی سے کیا واسطہ یہ محض قدرت کا فیضان ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے

ہے لطف فطرت میں اک تسلسل، ہو اسکے فیضان میں تنوع
نظر سے اوجھل ہوا جو سورج، تو چاند سے روشنی ملے گی

اس غزل کے یہ دو شعر خوب ہیں :-

سنبھل کے رہ، ہے جو رندِ مشرب حواس کھوئے تو کھو دیا سب
نہ ہو گا لطفِ خودی ہی حاصل، نہ لذتِ بیخودی ملے گی

جفائے تازہ سے کم نہیں ہے مگر پشیمانیِ جفا بھی،
جھکی نگاہیں اگر اٹھیں بھی تو آنکھ جھینپی ہوئی ملے گی

اثر لکھنوی جناب اثر کی غزل نظم کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ملک کی موجودہ فضا پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے وہ کامیاب چیز ہے۔

صرف ایک مصرعہ میں شکستِ نادار کا عیب پایا جاتا ہے :-

کہے نہ جاؤ یہ ہو کے نومید حاصل جہد کچھ نہیں ہے

تقطیع میں لفظ نومید کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

کہے نہ جاؤ (فعاعلاتن) یہ ہو کے نومی (فعاعلاتن)
دِ حاصلِ جہ (فعاعلاتن) دِ کچھ نہیں ہے (فعاعلاتن)

آجکل "شکستِ ناروا" کی طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ بڑا عیب ہے اور اساتذہ نے ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ جناب اثر چونکہ بہت محتاط شعراء میں سے ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا سہو ہے۔

ایسی بحروں میں جو مصرعوں کو برابر کے رکنوں میں تقسیم کرکے ان کے دو ٹکڑے علٰحدہ علٰحدہ کر دیتی ہیں، تقطیع میں کسی ایک ہی لفظ کا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر دو رکنوں سے متعلق ہو جانا، عیب ہے کیونکہ Rhythm پر اس کا اثر خراب پڑتا ہے اور کانوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔

شکست کی ایک قسم اور بھی ہے، وہ یہ کہ بجائے لفظ کے کسی سالم فقرہ کے دو ٹکڑے دو رکنوں سے متعلق ہو جائیں مثلاً جناب اثر ہی کا ایک مصرعہ ہے :-

نئی نویلی سحر کی کرنوں سے کھیلتی زندگی ملے گی

اس میں سے، تیسرے رکن میں چلا جاتا ہے، حالانکہ بہ لحاظ مفہوم اس کا تعلق مصرعہ کے دوسرے رکن سے ہے یہ بھی عیب ہے گو ایسا مکروہ نہیں، تاہم اساتذہ کو اس سے بھی بچنا چاہئے۔

وحشت کلکتوی

جناب وحشت کی غزل کے بعض اشعار خوب ہیں، مثلاً :-

مجھے ہے ناز اپنی زندگی پر کہ جس کی بنیاد درد پر ہے
بڑی ہی توہین درد ہوگی، دوا اگر درد کی ملے گی،

نشانِ سوزِ دروں ہمارا مٹا نہیں ہے نہ مٹ سکے گا
اگرچہ دل جل کے رہ گیا ہے، کچھ آگ پھر بھی دبی ملے گی

ان کا ایک شعر ہے :-

مسرتِ چند روزہ ہی کا فریب بھی کتنا دیرپا ہے
ہوس کو امید ہو رہی ہے کہ لذتِ زندگی ملے گی

پہلے مصرعہ میں روزہ کی ہ تقطیع سے خارج ہے۔ اور دوسرے مصرعہ میں "امید ہو رہی ہے" بھی کانوں کو بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا :-

ہوس کو اب بھی امید ہے یہ کہ لذتِ زندگی ملے گی

مقطع ہے :

زمانہ زندگی کا وحشت گزار دینا نہ ہوگا مشکل
نہیں ہے کم دل کی بیوقوفی، مدد پھر امید کی ملے گی

پہلے مصرعہ میں لفظ زمانہ بیکار ہے۔ دوسرے مصرعہ میں بیوقوفی، غزل کی زبان نہیں۔ دوسرا مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا :

"اگر یہی دل کی سادگی ہے، مدد پھر امید کی ملے گی

نوحؔ ناروی

جناب نوحؔ کی غزل ان کے مخصوص ذوق و رنگ کے لحاظ سے کامیاب چیز ہے، لیکن مقطع محل نظر ہے، فرماتے ہیں :-

تمھیں ہو لے نوحؔ صرف ایسے تمھیں ہو سچے مقلد انکے
کوئی کرے گا ہزار کوشش، کسے زباں داغ کی ملے گی

دوسرا مصرعہ بیان و زبان کے لحاظ سے درست نہیں، محاورہ کی رو سے اس خیال کو یوں ظاہر کرنا چاہئے —
"کوئی ہزار کوشش کرے مگر داغ کی زبان اسے نہ ملے گی"۔
حیرت ہے کہ جس شعر میں انھوں نے اپنی زباندانی کا دعویٰ کیا ہے، اسی میں وہ زبان کی غلطی سے نہ بچ سکے۔

مانیؔ جائسی

جناب مانیؔ کی غزل خوب ہے، لیکن شکستِ ناروا کا عیب کئی جگہ نظر آتا ہے۔ مثلاً :

بہ ہوش باش اے مسافرِ راہِ زندگی یہ وہ راستہ ہے

تقطیع میں راہ کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں، را، رکن دوم میں رہ جاتا ہے اور ہ رکن سوم سے ملکر زندگی کو ہزندگی بنا دیتی ہے۔ ایک اور مصرعہ ہے :-

نہ علمِ فردا، نہ لطف امروز اب رہی ایک یادِ ماضی

اس مصرعہ میں بھی، امروز کی زے تیسرے رکن میں چلی جاتی ہے اور لفظ امروز کے دو ناگوار ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔
مقطع ہے :-

یہ سچ ہے دنیا ہے آنی جانی، مگر یہ بزمِ جہانِ فانی
ہمیشہ خالی ہے جائے مانی، ہمیشہ اس کی کمی ملے گی

پہلا مصرعہ دوسرے سے غیر مربوط ہے اور طرزِ بیان ناقص۔ جو مفہوم مانیؔ صاحب ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ صرف اس طرح ظاہر ہو سکتا تھا کہ "بزمِ جہانِ فانی میں ہمیشہ جائے مانی خالی رہیگی"۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے :

یہ سچ ہے دنیا ہے آنی جانی، مگر ہر اک بزم میں یہاں کی
رہے گی خالی ہی جائے مانی، ہمیشہ اس کی کمی رہے گی

روشؔ صدیقی

روشؔ کی غزل بھی اچھی ہے، لیکن شکستِ ناروا کا عیب کئی مصرعوں میں پایا جاتا ہے مثلاً :-

ابھی سے شکوہ غلط ہے زہرابِ زندگانی کی تلخیوں کا

اس میں تقطیع کے بعد زہراب کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ زہرا دوسرے رکن میں شامل ہو جاتا ہے اور ب تیسرے

رُکن سے ملکر زندگانی کو بزندگانی بنادیتی ہے۔

ذیل کے مصرعوں میں بھی یہی عیب ہے:

وہ صبح جنّت کہ جس نے زاہد کو دین و دنیا سے کھو دیا ہے
یہی نشیمن تری نگاہوں کو جس نے محدود کر دیا ہے
یہ سوچتا ہوں کہ ان ستاروں کو کب نئی زندگی ملے گی
اگر یہ سچ ہے تو زلفِ گیتی کو اور کچھ برہمی ملے گی
ابھی تو اے دوست تلخیٔ غم میں تلخیٔ عیش بھی ملے گی
بلند ہوگا اسی شبستاں کے دوش پہ صبح نو کا پرچم

پہلے چار مصرعوں میں لفظ کو تیسرے رکن میں چلا جانا ہے، حالانکہ فقروں کی تقسیم کے لحاظ سے اسے دوسرے رکن میں جانا چاہیئے۔ پانچویں مصرعہ میں لفظ میں اور چھٹے مصرعہ میں لفظ کے دوسرے رکن میں شامل ہونا چاہیئے۔

روش کے یہ اشعار خوب ہیں:

شکستِ دل اور سکونِ دل کا مآل کیا ہے، یہ کون جانے
جہاں جہاں یہ سوال ہوگا، جواب میں خامشی ملے گی
غروبِ خورشید پر رہے گا فروغ شب کا مدار کب تک
یہ سوچتا ہوں کہ ان ستاروں کو کب نئی زندگی ملے گی

دوسرے شعر میں نئی زندگی، ذاتی و اصلی زندگی کے مفہوم میں نظم کیا گیا ہے، جو درست نہیں ہے۔

ماہر القادری

ماہر کی غزل کا مقطع خوب ہے:

ہوئے تھے جس دن اسیر ہم، سب چمن کے آثار کہہ رہے تھے
تم آؤ گے جب قفس سے چھٹ کر بہار جاتی ہوئی ملے گی

گو اس کا پہلا مصرعہ شکست کے عیب سے خالی نہیں۔ لفظ سب تیسرے رکن میں جانا چاہیئے، حالانکہ تقطیع میں وہ دوسرے رکن میں آتا ہے۔ باقی چار اشعار بھی نقص سے خالی نہیں۔

مطلع ہے:۔ جو تو نے دیکھا ہے خواب اُلفت تو اسکی تعبیر بھی ملے گی — جنوں ملے گا تو ساتھ اس کے ذرا ذرا آگہی ملے گی

دوسرے مصرعہ میں جب تک لفظ آگہی کے بعد بھی نہ ہو مفہوم تشنہ رہتا ہے، یہ مصرع یوں ہو سکتا تھا۔

جنوں ملے گا تو آگہی بھی ذرا ذرا ساتھ ہی ملے گی

دوسرا شعر ہے :

اس انجمن میں شریک ہونے سے پہلے ہی میں یہ جانتا تھا
نوازشیں دوسروں کی قسمت، مجھے فقط برہمی ملے گی

پہلے مصرعہ میں شکست کا عیب ہے، لفظ سے، تیسرے رکن میں چلا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا ناقص ہے جب تک قسمت کے بعد کوئی فعل (مثلاً ہوں گی) نہ لایا جائے مفہوم پورا نہیں ہوتا، یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے :

نوازشیں دوسروں پہ ہوں گی، مجھے فقط برہمی ملے گی

گو برہمی ملے گی بھی اپنی جگہ محل نظر ہے۔

تیسرا شعر ہے :

ازل کے دن جب بنائے ہستی رکھی تھی اعلان کر دیا تھا
سروں کو سودا نصیب ہوگا، دلوں کو آشفتگی ملے گی

رکھی تھی پہ تشدید کا اضافہ ہونا چاہئے۔ یہ نقص یوں دور ہو سکتا تھا :

ازل کے دن جب بنائے ہستی ہوئی تھی قایم تو کر دیا تھا

چوتھا شعر ہے :

وہ لالہ و گل کی انجمن ہو کہ ذرہ و خاک و خس کی دنیا
جہاں جہاں سوزِ عشق ہوگا، وہیں وہیں زندگی ملے گی

لالہ و گل میں تو خیر، سوزِ عشق کا پایا جانا تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن "ذرہ، خاک و خس" میں سوزِ عشق کہاں! یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے : وہ لالہ و گل کی انجمن ہو کہ بلبل زار کا قفس ہو

سپرو اکاڈیمی

اُردو کی دنیا میں سر تیج بہادر سپرو جس بلند مرتبہ کے مالک تھے، اُس سے آپ بخوبی واقف ہیں، اُن کی زندگی اُردو پرستی کی ایک لمبی کہانی تھی۔ دوستوں کی دوستی اور عزیزوں کی عزیز داری سے زیادہ اُردو عزیز تھی۔ اُردو کے معاملہ میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لئے زندگی کے آخری لمحات تک وہ طیار نہ ہو سکے۔ اُردو کے اس پُر عظمت محسن کی یاد میں "کتاب ساگر" نے پنڈت برج موہن دتاتریا صاحب کیفی کی سرپرستی میں "سپرو اکاڈیمی" قایم کی ہے۔

۱۹-۲۰ جنوری ۵۱ء کو دہلی میں یوم سپرو بھی منایا جا رہا ہے، جس میں ملک کے تمام اکابر شریک ہوں گے۔ مفصل حالات کیلئے ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کیجئے :- محمد عتیق۔ سکرٹری سپرو اکاڈیمی، کتاب ساگر۔ جامع مسجد۔ دہلی

باب الاستفسار

معیاری وغیر معیاری احادیث

(جناب سید تفضل حسین صاحب امروہہ)

جیسا کہ آپ کا خیال ہے، اس میں شک نہیں، احادیث پر بلا غور تامل اعتماد کر لینا اور اس اعتماد کی بنیاد پر اسلام و تعلیمات اسلام کا سمجھنا، بڑے خطرہ کی بات ہے، لیکن اس خطرہ سے دور ہونے کی صورت بھی کوئی نظر نہیں آتی جبکہ معیاری و غیر معیاری احادیث کے درمیان فرق کرنا بھی آسان نہیں۔ اگر اسماء رجال کو سامنے رکھا جائے تو بھی بہت سے ثقہ راویوں کی بعض روایات، اصولِ درایت پر صحیح نہیں اُترتیں اور اگر محض اصولِ درایت کو سامنے رکھا جائے تو پھر اسماء رجال کا فن بالکل بیکار ہو جاتا ہے، حالانکہ اس کی اہمیت اپنی جگہ ثابت ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی صورت کیفیت اطمینان پیدا کر دینے والی ہو سکتی ہے تو مطلع فرمائیے۔

(نگار) اگر آپ کوئی کتاب تصنیف فرما رہے ہیں یا کتب احادیث میں سے کسی کتاب کی شرح و تفسیر لکھنا چاہتے ہیں تو معیاری و غیر معیاری احادیث کے درمیان فرق و امتیاز کا کوئی اصول نہیں بتا سکتا، کیونکہ اس صورت میں آپ کو روایت و درایت دونوں کو فنی حیثیت سے سامنے رکھنا پڑے گا اور پھر ان دونوں کے درمیان مطابقت کی صورتیں ڈھونڈھنے میں آپ مبتلا ہو جائیں گے اور اس کا نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔ لیکن اگر خود اپنے اطمینان کے لئے کسی اصول کی جستجو میں ہیں تو بیشک آپ کو بتا سکتا ہوں۔

اس سلسلہ میں ان احادیث کا تو کوئی ذکر نہیں جن میں صرف اخلاقی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ عقل ان کے معارض نہیں ہوتی۔ اسی طرح معاملات کے متعلق بھی زیادہ بحث کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، لیکن وہ احادیث جن کا تعلق تاریخ، مابعد الطبیعیات، جزا و سزا" یا قرآنی تفسیر سے ہے، ان پر البتہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ سو ان صورتوں میں آپ کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ آپ صرف اپنی عقل سلیم سے کام لیجئے اور اس کے خلاف جو احادیث یا اقوال مفسرین نظر آئیں انھیں رد کر دیجئے۔ یعنی اگر آپ کسی حدیث کو سننے کے بعد آپ کو اس کے ماننے میں اس لئے تامل ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ

کی شان کے منافی ہے یا اسے عقل انسانی باور نہیں کرتی، یا یہ کہ قدرت خداوندی اور عظمت نبوت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی، تو اسے ہرگز نہ مانئے، خواہ اس کے راوی علی اور عایشہ ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ اس بات کا کوئی یقینی ثبوت بہم نہیں پہونچ سکتا کہ وہ روایت واقعی انھیں کی بیان کی ہوئی ہے یا بعد کے راویوں نے محض یقین دلانے کے لئے ان کا نام لے دیا۔ میں اس جگہ ایک مثال پیش کرتا ہوں، جس سے میرا مدعا زیادہ واضح طور پر ظاہر ہو جائے گا۔

کلام مجید کی مشہور آیت ہے: "انا اعطیناک الکوثر" (ہم نے تجھے کوثر عطا کیا) لفظ کوثر بروزن فوعل کثرۃ سے مشتق ہے، اور اسی لئے ابن ہشام اور طبری نے اس کا مفہوم "خیر کثیر" ظاہر کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان روایات کو بھی لے لیا جن کی رو سے یہ چشمۂ کوثر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب رسول اللہ سے کوثر کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "کوثر، بہشت کے ایک دریا کا نام ہے"۔ دوسری روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ "کوثر، پانی کا ایک چشمہ تھا جو معراج کے وقت مجھے دکھایا گیا تھا"۔

اس کے بعد پھر اس کی بھی ضرورت ہوئی کہ اگر کوثر دریا یا چشمہ ہے تو اس کے مزید حالات بیان کئے جائیں اور اس سلسلہ میں کچھ اور احادیث فراہم ہوگئیں جن سے دریائے کوثر کے کچھ اور حالات معلوم ہوئے یعنی یہ کہ "اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے" بلکہ یہاں تک کہ "اس کا پانی شراب ہے"۔

لیکن جب بعد کو "چشمۂ کوثر" کی یہ تعریف بھی کم معلوم ہوئی تو کچھ اور روایات پیش کی گئیں جن میں بتایا گیا کہ "اس کی تہ موتیوں اور لعل کی ہے اور اس کے ساحل سونے کے ہیں"۔

اب غور فرمائیے کہ ان صورتوں میں آپ کیا فیصلہ کریں گے۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ واقعی رسول اللہ نے کوثر کا وہی مفہوم بتایا تھا جو ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور کیا آپ کے لئے یہ آسان نہ ہوگا کہ ان سب روایات کو رد کر کے کوثر کے معنے صرف خیر کثیر کے قرار دیں۔

اس قسم کے مباحث کے لئے

"من و یزداں" کے دونوں حصے

ملاحظہ فرمائیے، جن کی مجموعی قیمت معہ محصول تیرہ روپیہ ہے — منیجر نگار۔ لکھنؤ

سورج کی آواز

اب کہاں وہ جلوہ گاہِ آدمِ یزداں صفات
میری کشتی نیل کی موجوں پہ لہراتی رہی
ہے مرا سوزِ دروں آئینۂ صبحِ نشور،
میں نے دیکھا ہے قلوبطرہ کے سینے کا گداز
مَیں نے دیکھے شورشِ باطل کے طوفانِ عظیم
مَیں نے دیکھی سطوتِ ضحاک و کسریٰ خاک پوش
مَیں نے دیکھا ریگ زارِ کربلا کو برق پاش،
مَیں نے دیکھی آتشِ ہنگامۂ بدر و حنین،
میری کرنیں خندہ زن ہیں ظلمتِ ایام پر
مَیں نے دیکھا ہے محمدؐ کا جمالِ جاوداں
مَیں نے دیکھے ٹمٹماتے عشق و مستی کے دیئے
کھا گئی آخر نسیمِ صبح کو بادِ سموم
زلزلے جنتی رہے گی تا بہ کے بوڑھی زمیں،
کتنے ساغرہائے کشتوں کے خون سے لبریز ہیں،
"روح" سے محروم ہیں لا انتہا پشمینہ پوش
آہ یہ شیخ و برہمن، یہ پجاری، یہ امام
کس قدر سیلاب آئے، بجھ گئے کتنے کنول،
بجلیوں کا گیت کب تک رنگ و بو کے ساز پر
زندگی کب تک رہے گی موت کی آئینہ دار!
متصل چلتے رہیں گے دل پہ نشتر تا بہ کے!

سرزمینِ مارو کژ روم بن گئی ہے کائنات
نیل کی موجوں پہ لہراتی رہی۔ گاتی رہی
باطنِ اہرام سے پھوٹا ہوں مثلِ سیلِ نور
جوئے شیر و ناقۂ لیلیٰ و گیسوئے ایاز،
ضربتِ شمشیرِ خالد، رزمِ فرعون و کلیم،
میری دنیا ماورائے عالمِ فردا و دوش
چلچلاتی دھوپ میں وہ پھول سے بچے کی لاش
یاد ہے مجھ کو ابھی گل کاریٔ خونِ حسینؑ
بارہا طیبہ کے میناروں پہ گزری ہے سحر
میرے ہم پہلو ہیں صدیوں سے زمین و آسماں
خانقاہوں میں نظر آئے ہیں کتنے بھیڑئے
یہ سُلگتے شہر، یہ خونی درندوں کا ہجوم
ہیں خدا کی مملکت میں کتنے ابلیسِ لعیں،
ہیں یہاں کتنے ہلاکو! کس قدر چنگیز ہیں!
کتنے ڈاکو ہیں جہاں میں! کسقدر بردہ فروش!
عصمت و ایماں کے تاجر، دین و دولت کے غلام
یہ زمانِ آتش و آہن! یہ شیشے کے محل!
چومتی ہے سنگ ریزوں کی جبیں موجِ گہر
تا بہ کے ہوتا رہے گا نورِ ظلمت پر نثار،
نوجواں کلیاں رہیں گی خاک بر سرِ تا بہ کے!

تابہ کے ٹکرائیں گے افلاک سے آہوں کے تیر! تابہ کے شعلے رہیں گے برق زاروں میں اسیر!
تابہ کے گلشن میں کانٹوں کا عَلَم لہرائے گا! وقت کب تک عیش خانوں پر لہو برسائے گا!
تابہ کے مظلوم سیارے رہیں گے پُرشگاف! روشنی پر تیرگی کب تک چڑھائے گی غلاف!
قصرِ شاہی کے زرافشاں، لالہ گوں محراب و طاق تیشۂ جمہور کا کب تک اُڑائیں گے مذاق!
جام و مینا میں کہاں تک زہر گھولا جائے گا! برگِ گل کو تابکے کانٹے پہ تولا جائے گا!
کاش ہو جاتا مقامِ آدمی مجھ پر بھی فاش، مجھ کو اس دنیا میں قرنوں سے ہے "انساں" کی تلاش

زندگی کا شعلۂ جولاں نظر آتا نہیں
اس خراب آباد میں "انساں" نظر آتا نہیں!

افسر سیمابی احمد نگری

رُباعیات

کس باغ کا تو حُسنِ نمو ہے اے دوست! کس پھول کی تو پریدہ بو ہے اے دوست!
میں تجھ کو لباسِ شکر پہنا نہ سکا کتنی فکرِ لطیف تو ہے اے دوست!

بیگانہ ہم نظر بنالوں تجھکو، یوں اہلِ زمانہ سے بچالوں تجھکو
ممکن ہو اگر کسی طرح سے اے دوست! خود اپنی نظر سے بھی چھپالوں تجھکو

چہرے پہ وہ سیلابِ تبسم ہے ہے سینے میں وہ اک جوشِ تلاطم ہے ہے
کانوں میں مرے گونج رہا ہے اب تک وہ راست کا خاموش ترنم ہے ہے

کل شب کہ فضائیں مست بے جام و سبو تھا ہوش کی تسخیر میں نہ میں اور نہ تو،
اُڑ اُڑ کے حریمِ روح تک جاتی تھی، وہ تیرے بدن کی بھینی بھینی خوشبو

وہ کاکلِ دلنواز مہکی، ہر بات کلی کی طرح لہکی لہکی،
ہنگامِ سحر بھی دل میں ہے رقص کناں اے دوست! تری نظر وہ بہکی بہکی،

جگن ناتھ آزاد

وحشت کلکتوی :۔

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں
ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں

یہ کیا ہجومِ تمنا ہے، خیر ہو یارب
ہم اُن سے ڈرتے نہیں، اپنے دل سے ڈرتے ہیں

تری نگہ کو نہیں بنتی بے جواب دئے
لبِ خموش کچھ ایسا سوال کرتے ہیں

کہا ہے اُس نے تو آنے کو، پر مرے دل میں
طرح طرح کے خیالات کیوں گزرتے ہیں

دلیلِ پستیِ ہمت ہماری ظاہر ہے
شکایتِ ستمِ روزگار کرتے ہیں

دکھائیں کیوں نہ وہ اندازِ حُسن میں جدت
کہ فنِ عشق میں ہم اجتہاد کرتے ہیں

وہ ہنس کے کہتے تھے آج اپنے ملنے والوں سے
سُنا ہے حضرتِ وحشت بھی ہم پہ مرتے ہیں!

اکرم دھولیوی :۔

جہانِ حسرت میں کیا توقع کہ ہم کو آسودگی ملے گی
نہ دل سے جائے گی یاد تیری نہ عشق سے مخلصی ملیگی

کشاکشِ اضطرار کب تک اذیتِ انتظار کب تک
کوئی گھڑی تیرے غمزدوں کو نوید آرام بھی ملے گی؟

ابھی تو محوِ ستم ہو لیکن وہ آئے گا وقت اک نہ اک دن
جفا کی آنکھوں میں ہونگے آنسو وفا کے لب پر ہنسی ملیگی

کبھی مسرت بھرا ترانہ کبھی غم و یاس کا فسانہ
بلند و پست حیات ہی میں حقیقتِ زندگی ملے گی

نہ عندلیب آج کوئی نالاں نہ کوئی اہلِ جنوں غزلخواں
چمن چمن منظرِ بیاباں قفس قفس خامشی ملے گی

بدل گیا اس قدر زمانہ کہ عافیت ہوگئی فسانہ
نہ پرسکوں آشیاں ملیگا نہ مطمئن زندگی ملے گی

شمیم نعمانی :۔

نومیدیٔ جاوید کو آساں نہ سمجھئے
ہر غنچہ چٹکتے ہی کبھی گل بھی ہوا تھا!

ہر طرزِ توجہ سے تسلی نہیں ہوتی
دل کشتۂ اندازِ تغافل بھی ہوا تھا!

امیدوں میں اندازۂ حسرت کی کمی ہے
ورنہ کبھی جینے میں تامل بھی ہوا تھا!

اب سر درِ دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں
نیرنگِ وفا ننگِ تحمل بھی ہوا تھا!؟

تائید ہوا خواہیٔ دل مانگ نفس سے
عقدہ چمن آرائے توکل بھی ہوا تھا!

جو دل پہ گزرتی ہے بہاروں سے نہ کہنا
اب پھول بھی چبھ جاتے ہیں خاروں سے نہ کہنا

اک طور بھٹکتا ہے کہ غم خانۂ ہستی
خاموش محبت کے شراروں سے نہ کہنا

طوفانِ حیاتِ ابدی ڈھونڈ رہے ہیں
آسودہ و خاموش کناروں سے نہ کہنا

انجم رضوانی :

دوائے درد ہو چکی، فسوں دعا کا چل چکا
سنبھل چکا، بس اب ترا مریضِ غم سنبھل چکا

شرر فشانیاں بھر آج دل کی رنگ لائینگی
وہ شامِ غم بھر آگئی وہ آفتاب ڈھل چکا

جی بھر کے تمھیں دیکھا بھی نہ تھا، گم عقل ہوئی اور سانس گئی
تھی دیر نگاہیں ملنے کی، ہم جیت تمھاری مان گئے

تسکین کی صورت بھی تو کچھ اور نہیں ہے
ورنہ ترے وعدوں پہ یقیں تھا نہ یقیں ہے

نگاہ مضطر و لرزاں ہے دل دھڑکتا ہے
کہ پردۂ رخِ پر نور پھر سرکتا ہے

ابھی تو آپ میں گم ہوں، تری تلاش کہاں
ابھی تو اس کے تصور سے دل دھڑکتا ہے

سر ہوئی سرحدِ جنوں اب کوئی مدعا نہیں
آپ سے بھی غرض نہیں غیر کا بھی گلا نہیں

سوزِ غمِ فراق سے کچھ تمھیں آگہی بھی ہے
عشق کی یہ لطیف چوٹ دل پہ کبھی سہی بھی ہے!

اے کہ مرے سکوت پر تجھ کو ہے وہم بیہشی
مدِ نظر مگر تجھے میری حق آگہی بھی ہے!

طرفہ قریشی بھنڈاروی :-

فضا ساکت، زمیں سے تا بہ گردوں ایک سناٹا
یہ کس منزل میں میری زندگی کا سلسلہ ٹوٹا!

ترے ہاتھوں مرے دل کی تباہی، اے زہے قسمت
مگر یہ رنج ہے تیری خوشی کا سلسلہ ٹوٹا

مری دنیا کے ذروں پر یہ تنقیدیں ستاروں کی
مرے دل سے اب اُن کی برتری کا سلسلہ ٹوٹا

خراشیں سینۂ گیتی کی خون آلود پاؤ گے
اگر انسانیت سے آدمی کا سلسلہ ٹوٹا

زباں پر میری کیوں آئے بیان جام و مُل طرفہ
ہوئی مدت کہ ذکرِ مے کشی کا سلسلہ ٹوٹا

اختر انصاری اکبر آبادی :-

یہ زندگی یہ عروج و پستی ہر اک نفس ہے فریبِ ہستی
جو یہ دھندلکے عبور کر لے تو دور تک روشنی ملے گی!

تری جوانی نکھر رہی ہے مری تمنا پہ مسکرا دے
ترے تبسم کی تابشوں سے جنوں کو تابندگی ملے گی!

اے لذتِ غم مرمر کے ہمیں جینے کا سلیقہ آیا ہے!
جو غم نہ گوارا ہوتا ہو اُس غم کو گوارا کرتے ہیں

خود آکے چراغِ راہ بنو آواز سنانے سے حاصل؟
گم کردۂ شوقِ منزل کو چھپ چھپ کے پکارا کرتے ہیں؟

نہ جانے شام کی تاریکیوں میں کیا ہوگا
سحر سے آج چمن میں ہے شاخِ گل لرزاں

مطبوعات موصولہ

مراۃ الشعراء جلد دوم۔ از محمد یحییٰ تنہا۔ جلد اوّل کی اشاعت کے تقریباً ایک سال بعد تنہا نے مراۃ الشعرا کا دوسرا حصّہ بھی شایع کر دیا ہے۔ پہلی جلد کی طرح اس کا اندازہ بھی قدیم تذکروں کا سا ہے پہلی جلد شیفتہ پر ختم ہوئی تھی اور پانچ ادوار قایم کئے گئے تھے، دوسری جلد امیر مینائی سے شروع ہو کر تنہا پر تمام ہوتی ہے، اس میں دورِ ششم و ہفتم کے شعراء شریک بزم ہیں، دونوں ادوار دو دو طبقوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں، اس طرح تقریباً چار سو صفحات میں تینتالیس شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ مختصر حالات، تبصرہ اور انتخاب کے علاوہ کہیں کہیں ذاتی اور نجی تاثرات کا ذکر بھی شامل ہے کیونکہ دورِ ہفتم کے شعراء مصنف کے ہم عصر ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف حصّے مختلف اوقات میں اور طویل وقفوں کے بعد لکھے گئے ہیں ایسا کرنا کچھ بے جا نہ تھا لیکن جب انھیں ایک مربوط تصنیف کی شکل میں شایع کیا جا رہا تھا تو اُن پر نظرِ ثانی کر لینے کی ضرورت تھی کیونکہ اس میں بہت سی اطلاعات "باسی" ہیں۔ مثلاً اب جبکہ جوش ملیح آبادی کے دس مجموعے شایع ہو چکے ہیں، اُن کے چوتھے مجموعے کے لئے یہ کہنا کہ ابھی حال ہی میں شایع ہوا ہے، نامناسب ہے۔ کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء کے ابتدائی مہینوں میں مرتب کی گئی ہے لیکن ثاقب لکھنوی، جلیل مانکپوری وغیرہ کا ذکر اس طرح ہے گویا وہ ابھی زندہ ہیں۔ تاہم یہ کتاب عام مطالعہ کے لئے اچھی ہے کیونکہ ایک ہی جلد میں دورِ جدید کے اہم شعراء کے انتخابات مل جاتے ہیں۔ بعض انتخابات بہت اچھے ہیں اور شعراء کی نمایندگی کرتے ہیں۔

تنہا صاحب نے یقیناً بڑی کاوش سے یہ مجموعہ مرتب کیا ہوگا لیکن دورِ جدید کے عام تنقیدی رجحانات سے کام نہ لینے کی وجہ سے اُردو شاعری کے ارتقاء کا اندازہ اس تصنیف سے نہیں ہوتا۔ ادب کے تغیرات سماجی تغیرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات شعوری اور غیر شعوری طور پر آج ہر شاعر اور نقاد تسلیم کرتا ہے، تنہا صاحب نے شعراء کا الگ الگ جایزہ لے کر انھیں محض رسمی طور پر مختلف ادوار میں رکھ دیا ہے۔ شعراء کے تذکرے میں بھی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، مثلاً جگر کا تذکرہ چکبست سے پہلے، جوش کا ذکر ظفر علی خاں، ساحر، نظر، سایل، بیخود، کیفی سے پہلے کسی طرح مناسب نہیں۔ جہاں تک افادیت کا تعلق ہے یہ کتاب اُردو شاعری کے طالبعلموں

کے لئے ضرور مفید ہوگی۔ کتاب کی قیمت چھ روپیہ ہے اور شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

مسدس بے نظیر

(مصنفہ جاںؔ صاحب) مرتبہ محمد علی خاں اثرؔ رامپوری۔ جب دہلی کی مغل سلطنت کا زوال ہوا تو کئی اور اہم دربار وجود میں آئے۔ ایسے درباروں میں رامپور کئی حیثیتوں سے قابل مطالعہ ہے۔ غدر کے قریب جب عام طور سے جاگیرداری نظام کو ضرب کاری لگی تو رامپور بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا اور فارغ البالی کے لحاظ سے واقعی دارالسرور بن گیا۔ ادیبوں، شاعروں، رقص و موسیقی کے ماہروں کی سرپرستی نے رامپور کو تاریخ ادب میں بھی اہم جگہ دلا دی ہے۔ یہ مسدس اس سرپرستی کا ایک بڑا ثبوت فراہم کرتا ہے کیونکہ یہ محض ایک نظم نہیں ہے بلکہ معلومات کا خزانہ ہے۔

نواب کلب علی خاں جب رونق آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے مارچ ۱۸۶۶ء میں ایک میلے کی بنیاد ڈالی جو بے نظیر کا میلہ کہلایا۔ اِس میلے نے اتنی اہمیت اختیار کی کہ رامپور سے وابستہ ہر شاعر نے اس کا ذکر کیا، صرف غالبؔ نے اپنے خط میں تذکرہ کرنے پر اکتفا کی ہے۔

محمد علی خاں صاحب اثرؔ رامپوری نے اس میلے کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے قلم اُٹھایا تو میر یار علی جاںؔ صاحب کا یہ قلمی مسدس بھی دستیاب ہوا۔ اب یہ مسدس ایک طویل پر از معلومات، دلچسپ مقدمہ کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ جاںؔ صاحب ریختی کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں، اس مسدس کی زبان اور انداز بیان بھی وہی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موضوع سے ہٹ کر جاںؔ صاحب اس لب و لہجہ میں کوئی کامیاب چیز نہیں لکھ سکتے تھے۔ اِس میں رعایت لفظی اور صنایع کی بھرمار ہے لیکن وہ روانی اور شوخی نہیں جو اُن کی ریختی کی غزلوں میں ملتی ہے۔

اثرؔ رامپوری نے بڑی کاوش سے بے نظیر کے میلے کے حالات جمع کئے ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اُن صاحبانِ کمال کے متعلق بھی بہت سی معلومات اکٹھا کر دی ہیں جن کا ذکر کسی طرح اس مسدس میں آگیا ہے۔ مختلف پیشوں کی بہت سی اصطلاحوں اور بہت سے محاورات کی تشریح کی گئی ہے جو استعمال نہیں ہوتے۔ محض ایک میلے کا تذکرہ ہونے کی حیثیت سے تو شاید یہ ساری محنت کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہوتی لیکن جو ضمنی واقعات اور علمی مسایل اس سلسلہ میں بیان ہو گئے ہیں وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اثرؔ صاحب کے ذوق تحقیق کا پتہ دیتے ہیں۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ مجلد، کتاب مصنف سے خسرو باغ روڈ رامپور یوپی سے حاصل کیجا سکتی ہے۔

۱۹۴۹ء کی بہترین نظمیں

مرتبہ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور ۱۹۴۱ء سے ہر سال، سال کی بہترین نظموں کا انتخاب شایع کرتا ہے۔ یہ انتخاب

چونتیس نظموں پر مشتمل ہے اور ان میں سے نوّے فیصدی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ سمجھی نہ جا سکیں۔ حلقۂ ارباب ذوق نے ہمیشہ ابہام اور اشاریت کو شاعری کا اہم ترین جزو قرار دیا ہے چنانچہ اس کے انتخاب میں صرف ایسی ہی نظمیں آسکتی ہیں جنھیں سادگی، صفائی، روانی اور انداز بیان کی لطافت سے کوئی واسطہ نہ ہو، رہا معنویت کا سوال، وہ ابہام اور اشاریت کی بھول بھلیاں میں پہیلی بوجھنے سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتا۔ حلقہ کو چاہئے کہ وہ بہترین کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے والا کوئی اور لفظ استعمال کرے۔ بہرحال جن لوگوں کو اس قسم کی شاعری سے دلچسپی ہو انھیں یہ مجموعہ ایک روپیہ چار آنہ میں گوشۂ ادب چوک انارکلی لاہور سے مل سکتا ہے۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب ہے۔

سیاست نامۂ عالم از پروفیسر نکہت شاہجہانپوری۔ بقول مصنف "یہ ایک منظوم سیاسی ڈراما" ہے، جس میں مشرقی و مغربی اقوام کے اوضاع و احوال اور آراستہ و مسخ شدہ خدوخال کو دکھایا گیا ہے اور جس کا غائر مطالعہ دنیائے مستقبل کے سیاسی نظام کے لئے آئینۂ بصیرت و بصارت ہے۔" اردو میں منظوم ڈراموں کی بہت کمی ہے، ڈراما کی فنی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس وقت تک کوئی کامیاب منظوم ڈراما نہیں لکھا گیا ہے، مرزا رسوا، شوق قدوائی اور بعض دوسرے حضرات کی کوششیں بہت پسندیدہ نہیں کہی جا سکتیں، حرف آخر، قولِ فیصل اور نئی دنیا کو سلام کی تکنیک ڈراما سے بہت مختلف ہے۔ تصنیف زیر نظر ڈرامائی عناصر سے بالکل خالی ہے اور ساری فضا اس قدر مصنوعی ہے کہ کوئی منظر ذہن میں کوئی نقش نہیں بناتا۔ مصنف کو موضوع پر بھی قدرت حاصل نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اور ختم جنگ کے بعد یورپ، امریکہ اور ایشیا میں جو سیاسی کشمکش رہی ہے مصنف اس سے بہت سطحی واقفیت رکھتا ہے۔ سامراج اور سرمایہ داری فاشزم اور اشتراکیت کے بنیادی محرکات سے پوری طرح واقف ہوئے بغیر اس موضوع پر نثر میں کچھ لکھنا مشکل ہے چہ جائیکہ نظم میں، جس کی فنی دشواریاں اور قیدیں اور پیچیدگی پیدا کرتی ہیں۔ ڈراما کے کردار پوری طرح نمایندگی نہیں کرتے، پھر کارکنانِ قضا و قدر کی گفتگو اور فیصلہ الٰہی تو اس نظم کے سب سے زیادہ بناوٹی حصے معلوم ہوتے ہیں۔

اس ڈراما میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی بہت ہیں جن میں سے اکثر معمولی کوشش اور کاوش سے درست ہو سکتی تھی۔ پروفیسر نکہت نے نظم و نثر میں کئی اور کتابیں لکھی ہیں ہمارا خیال ہے کہ اس نظم سے انکی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس ڈراما کو مکتبۂ سلطانی بمبئی ۳ نے شایع کیا ہے اور ایک روپیہ آٹھ آنہ میں مل سکتا ہے۔

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں مرتبہ اصغر علی عابدی۔ کتاب کے نام سے پوری طرح اندازہ نہیں ہوتا، لیکن نام کے بعد ہر لفظ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ

مضامین کا یہ مجموعہ روس اور اس کے اشتراکی نظام کی مخالفت میں مرتب کیا گیا ہے۔ بائیس صفحوں کے طویل مقدمہ کے علاوہ کتاب آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے جس میں بائیس باب ہیں۔ یہ باب مختلف اخبارات اور رسایل سے لئے گئے ہیں۔ اکثر ترجمہ اور ماخوذ ہیں جن کے متعلق دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ مستند جگہوں سے لئے گئے ہیں اور "ان کا حوالہ ہر وقت دیا جا سکتا ہے"۔ مرتب نے مقدمہ میں تحریکوں کی قسمیں اور اُن کی پیدائش نیز ارتقا اور زوال کا فلسفہ بیان کیا ہے جو دلچسپ ضرور ہے لیکن درست نہیں ہے۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرتب کے پیش نظر علمی خدمت سے زیادہ مذہبی تبلیغ تھی۔ تمام مضامین اسی نقطۂ نظر سے لکھے اور لکھوائے گئے ہیں اس لئے ہر ایک میں اس جانبداری کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۱۷ء سے اس وقت تک روس کے متعلق دشمنوں اور دوستوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ سیاسی حالات کے تغیر پذیر ہونے کی وجہ سے دوست دشمن میں اور دشمن دوست میں تبدیل ہوئے ہیں لیکن اس بات کو تو روس کے بڑے سے بڑے مخالف نے تسلیم کیا ہے کہ گزشتہ تیس بتیس سال میں وہاں کی دنیا نہ صرف بدل گئی ہے بلکہ اس میں ہر پہلو سے ترقی ہوئی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ بعض نظام اخلاق اور مذہب اسے ترقی نہیں تنزل کہتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ روس میں برائیوں کے سوا اور کچھ نہیں اور ساری دنیا کو اس سے خبردار رہنا چاہئے۔ امریکہ کے سرمایہ دار پریس نے روس کے خلاف اتنا لٹریچر اکٹھا کر دیا ہے کہ بڑی آسانی سے درجنوں ایسی کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔ سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ روس کے گرد آہنی پردہ پڑا ہوا ہے اور کوئی بیرونی شخص وہاں کی زندگی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، دوسری طرف وہاں کے عیوب اس تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑا واقفکار بھی متحیر رہ جائے یہی چیز حقیقت کو ظاہر کر دیتی ہے اور تحقیقات کا پول کھل جاتا ہے۔

یہ کتاب مکتبۂ نشاۃِ ثانیہ حیدرآباد دکن نے شایع کی ہے۔ اس ادارے کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعتِ اسلامی کی اعانت حاصل ہے اس لئے وہاں سے کسی ایسی کتاب کا شایع ہونا جو اشتراکیت کے خلاف ایک ذہنی فضا طیار کرنے میں مدد دے بالکل قرین قیاس ہے۔ قیمت تین روپیہ ہے۔

جمہوریت اور مغربی تحریکیں

مکتبۂ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد ہی نے یہ کتاب بھی شایع کی ہے۔ یہ چیکوسلوواکیہ کے مشہور سیاسی رہنما اور سابق صدر کے چند خطبات اور چند تقریروں کا مجموعہ ہے جو دنیا میں اکثر اہم زبانوں میں شایع ہو چکا ہے۔ پہلے فرانسیسی زبان سے ان کا ترجمہ عربی میں ایک مصری فاضل نے کیا، عربی سے اُردو ترجمہ عبدالوہاب ظہوری نے کیا ہے۔ کتاب پر ایک دلچسپ اور معلوماتی مقدمہ شاہین فاروقی صاحب نے لکھا ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں کئی کئی مباحث شامل ہیں۔ ابواب کے ناموں ہی سے کتاب کے موضوع کا اندازہ ہو سکتا ہے مثلاً یورپ کی ذہنی و سیاسی بیداری اور نئی جمہوریت، پہلی عالمگیر جنگ اور اُس کا اثر یورپ کی جمہوریت پر، یورپی جمہوریتوں کے زوال کے اسباب، مجلس اقوام، نئی جمہوریت دشمن تحریکیں، نئی عالمی جنگ، جمہوریت کا مستقبل۔ ان ابواب کے ضمن میں قومیت، بین الاقوامیت، فسطائیت اور اشتراکیت کی بحثیں بھی آئی ہیں۔ ایڈورڈ بنیس کی حیثیت محض ایک نظریاتی عالم کی نہیں تھی بلکہ وہ خود یورپ کے سیاسی میدان کا ایک اہم زور آزما تھا اور اپنی ترقی پسندی کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یورپ کی جمہوری تحریکوں کے متعلق اُس کے خیالات بہت زیادہ قابلِ غور ہیں۔ لیکن شاہین فاروقی صاحب نے اپنے مقدمہ میں جمہوریت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں ہے۔ یورپ کی اکثر نام نہاد جمہوری حکومتیں سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کے تحت عمل کر رہی تھیں، اس لئے اُس کے یہاں تضاد تھا اور جب تک یہ تضاد باقی ہے جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ خود جمہوریت عیب نہیں ہے بلکہ اُسے سرمایہ دارانہ اور سماجی مفاد کے لئے استعمال کرنا عیب ہے یہ دونوں صورتیں جمہوریت کی نفی کرتی ہیں، بنیس کا بھی یہی خیال ہے گو اُس نے بالکل واضح الفاظ میں یہ نہیں کہا ہے۔ سیاسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد دکن سے تین روپیہ میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

نیا ادب پنڈت کشن پرشاد کول۔ پنڈت کشن پرشاد کول ستھرے مذاق کے بزرگ ہیں، عام طور پر بزرگوں کا مذاق جدید ادبی تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ جدید ادب کے مطالعہ اور نئے ادبی ذخیرے کی چھان بین کی طرف اہم توجہ صرف نہیں کرتے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ پنڈت کول نے نئے ادب کے متنوع اور رنگا رنگ میدان کی سیر کی اور اس موضوع پر سنجیدگی اور محنت سے لکھا۔ نئے ادب کا تاریخی جایزہ لینے کی جرأت ابھی خود نئے ادیب بھی اس انداز سے نہیں کر سکے۔ اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف کی شدید ضرورت تھی۔ کول صاحب کی کتاب گو اس ضرورت کو بہمہ وجوہ تو پورا نہیں کرتی تاہم اس سمت میں ایک خیال افروز اقدام ضرور ہے۔

یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً رسالہ اُردو میں چھپتے رہے ہیں۔ بعض مضامین نئے ادب، نئے افسانے اور نئے افسانہ نگاروں پر ہیں، چھ مختلف افسانہ نگاروں پر، دو پریم چند پر اور ایک نئی شاعری پر۔ کول صاحب کا لہجہ اس دکٹورین نقاد کا سا ہے جس نے بیسویں صدی کے وسط میں پہلی بار ایلیٹ کو مطالعہ کے لئے قلم اُٹھایا ہو۔ نئے ادب نے پرانے معیاروں سے سرتابی کی ہے اور وہ ہنوز اپنا واضح و مستقل معیار استوار نہیں کر سکا ہے۔ کول صاحب ایک معیار کا مطالبہ کرتے ہیں اور انھیں شکایت ہے کہ وہ معیار قدیم کیوں نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب اور نئے ادب میں انھوں نے خط امتیاز نہیں کھینچا ہے اور اس طرح وہ سردار جعفری اور حسن عسکری دونوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو صحیح نہیں۔ ان کا فرمانا کہ:۔

"نیا ادب وہی قسم کے مصنفین اور لٹریچر سے بھرا پڑا ہے یعنی یا تو اس میں وہ ہیں جو کارل مارکس کے فلسفے کے معتقد ہیں اور اگر معتقد نہیں تو ان کا رجحان ادھر ہے یا وہ ہیں کہ جن کو فرائیڈ کے فلسفۂ نفسیاتی تجزیہ کا روگ بری طرح لگا ہوا ہے اور کسی قسم کا ترقی پسند ادب مجھے نئے ادب میں دکھائی نہیں دیتا۔"

بڑی حد تک سادہ ہے حالانکہ نئے ادب کے مسایل زیادہ پُر پیچ ہیں اور ان کی گرہیں فرائیڈ اور مارکس کے نظریوں سے نہیں بلکہ تاریخی و سماجی حالات سے پڑی ہیں۔

پریم چند اور کرشن چندر پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، کاش اس میں سنجیدگی کے ساتھ ایک ہمدردانہ مفاہمت کا عنصر بھی موجود ہوتا۔ بڑا اچھا ہوتا اگر یہ کتاب نئے ادب کی غیر جذباتی تاریخ ہوتی تاکہ اس آئینہ میں جدید ادب بھی اپنے داغ دھبے زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتا۔ بہرحال کوکل صاحب کی کتاب خیال افروز بھی ہے اور تعمیری بھی۔ انکے بعض اعتراضات بے جا بھی نہیں۔ عسکری، میراجی اور عزیز احمد پر ان کی گرفت کڑی ہے اور ان کے وار بھرپور ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ جو معیار ان کے سامنے ہے وہ اعلیٰ و ارفع ہوتے ہوئے بھی نئے ادبی شعور کے لئے ناقابل التفات ہے اور اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ خود ابھی تک کوئی ایسا موقف حاصل نہیں کر سکا، جہاں پہونچکر وہ یہ غور کر سکے کہ انسانی زندگی کا جمالیاتی عنصر نکالنے کے بعد "ادب برائے زندگی" بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

شایع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ کراچی۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔

شبلی کی حیات معاشقہ

مغربی تنقید نے جب سے اپنے رشتے سماجی علوم اور خصوصاً "تجزیہ نفسی" جوڑے ہیں، نئے نئے تجربے فروغ پانے لگے ہیں، خیر مغرب میں تو تنقید کی یہ بحران کا یہ دور کم و بیش گزر گیا مگر اُردو میں ابھی اس کی ابتداء ہے۔ وحید قریشی نے اس کتاب میں شبلی کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ نہ ان کے ادبی شخصیت کی تصویر ہے نہ ان کے سوانح حیات۔ مصنف نے ان کے بچپن کی اُلجھن، ماں کی محبت، بھائی سے نفرت۔ سرسید سے مقابلے کی کوشش، ان سب کا حل فرائیڈ کے تحلیل نفسی سے اصولوں پر تلاش کیا ہے اور اس پس منظر میں ان کی عشقیہ زندگی کا بڑا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

"۔۔۔۔ جس کے تین مرکز تھے ایک ابوالکلام کی ذات دوسرے عطیہ بیگم اور تیسرے علہ اس کی کوئی بہنیں۔"

شبلی کی داستانِ معاشقہ پر اب کافی مواد جمع ہو چکا ہے۔ سید سلیمان اسے رسوائی سمجھیں مگر شبلی کی زندگی کے اس پہلو کو سامنے لانا ان کے کردار کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری تھا، لیکن ہر چند شبلی کی حیات معاشقہ کو ان کی ادبی زندگی سے زیادہ اہمیت دینا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن وحید قریشی کا مقصود اس کتاب کی اشاعت سے انکی حیات عشقیہ ہی پر روشنی ڈالنا تھا، اس لئے اس میں شبلی کی ادبی زندگی سے بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ کتاب اپنے حسن و استدلال اور طرز ادا کے لحاظ سے بڑی اہمیت آفریں چیز ہے۔ مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

اپنی نگریا ممتاز شیریں کے چھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مصنفہ افسانوی تنقید نگاری کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں، لیکن ان کے افسانے ایسے نہیں کہ خود ان کے اصول تنقید کے متحمل ہو سکیں۔ کہانیاں معمولی موضوع مختصر اور انداز بیان غیر افسانوی ہے۔ مصنفہ کو اعتراف ہے کہ:۔ "میرا مشاہدہ بہت محدود ہے... اسلئے میرے افسانوں کا دایرہ بھی محدود ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ قریبی مشاہدے اور گہرے مطالعہ کے بغیر کسی اچھے اور گہرے افسانے تخلیق مشکل ہے"۔ "اپنی نگریا" سب سے اچھا افسانہ ہے، اس میں صاف ستھری گھریلو زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور بڑے توازن کے ساتھ۔ اس کا سماجی پس منظر مختصر ہوتے ہوئے بھی بڑا دل آویز ہے "آئینہ" اور "انگڑائی" کے متعلق مصنفہ اور عسکری (دیباچہ نگار) دونوں کا یہ دعوے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے کہ:۔ "اردو کے کسی افسانے میں میلان جنسی کے متعلق ایسا صحت مند نظریہ پیش نہیں کیا گیا"۔ اول تو میلان جنسی ایسا اہم موضوع نہیں جس کے بغیر اردو افسانہ تہی دامن رہ جاتا علاوہ اسکے میرے نزدیک اپنے موضوع کے لحاظ سے دوسرے درجہ کا افسانہ ہے جس میں اسٹیج کی طرح ایسے مکالمے بھی ملتے ہیں:۔ "تم نے میرے خون کو چھینا ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو، کہتی ہو میرا دل بچی سے پھر گیا ہے اسکی ذمہ دار تم ہو۔ تمھاری طرف سے میں نے میری ننھی کو اتنا ستایا میں حسد کی آگ میں بھن رہی تھی، سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان"۔ مجھے مصنفہ کے اس اعلان پر اب بھی بھروسہ نہیں کہ "تکنیک میں تجربہ کرنے کا خیال میرے کسی افسانہ کا محرک نہیں ہوا"۔ مطبوعہ مکتبۂ جدید لاہور۔ قیمت تین روپیہ بارہ آنہ۔

پچھتاوے شفیق الرحمٰن کے افسانے اپنی غیر حقیقی فضا اور قوس قزح کی طرح ہم سے دور ہوتے ہوئے بھی دلکش نظر فریب ہیں۔ حجاب امتیاز علی کی اجنبی رومانویت اور شہاب کی سرگزشت کا شاداب و شدید جذبہ کہیں کہیں مزہ دے جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا میں یکسانیت ہے، قصوں کی ترتیب میں بھی یہی رنگ ہے اگر وہ اس فضا میں زیادہ تنوع اور حقیقی چیز تو فراہم کر سکیں تو ان کے افسانے کامیابی کی نئی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی پاکیزہ ہے، پھر بھی قیمت زاید ہے ۔ مکتبۂ جدید لاہور۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنے۔

نفسانے یہ غالباً نفسیاتی افسانوں کا خلط ملط ہے اور برا نہیں۔ لیکن نہ اس میں نفسیات کا رنگ ملتا ہے اور نہ افسانوی وقار۔ ان افسانوں کی ترتیب اور طرز بیان دونوں میں بستدی کا سا انداز ملتا ہے۔ "کٹی ہے رات تو" اور "سب کا مالک" معمولی افسانے ہیں۔ البتہ "اسٹینوگرافر" کا نفسیاتی ردعمل بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ مکتبۂ جدید لاہور قیمت ہے

جہنم کے دروازوں پر اردو میں مذہبی ادب کے سلسلہ میں توبۃ النصوح اور مسدس حالی کو کون فراموش کر سکتا ہے، لیکن بیسویں صدی میں مذہب کی بنیاد پر کسی ناول کی تعمیر کے لئے اسعد گیلانی ہی کی جرأت درکار تھی، اس ناول کو ایک سپاہی کی ڈائری کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ پلاٹ کے لحاظ سے سپاٹ، کردار نگاری تنوع کے باوجود بہت محدود، مکالمے غیر متوازن اور طرز بیان کافی ثقیل ہے۔ اس کا پورا مرکزی تخیل یہ ہے کہ تمام مجلسی اور انفرادی مسایل کا حل مذہب ہی میں تلاش کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نظریہ اپنی جگہ صحیح ہو لیکن اس کو ناول کے ذریعہ سے پیش کرنا مذہب اور ادب دونوں کی توہین ہے۔ قیمت ۸ ہے۔ مکتبۂ افکار نو۔ کراچی۔

مکتوباتِ نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذباتِ نگاری، اسلامت بیان رنگینی اور البیلے پن کے طاقہ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جنکے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کردیا گیا ہے۔ اور ۱۲۰ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ سوم چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکتِ بیان انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے اُنکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ مادمین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ۱۔

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ انشا اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی

تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری میں کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان طریقت و علمار کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت ۸ آنہ

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت:۔

ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص شعرا کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے قیمت حصہ اول للعہ حصہ دوم للعہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری، فروری ۵۰ء

نگار ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۲۲ء سے لیکر ۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجدلین نمبر" ہے جس میں ایک بیسٹل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار تربیجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۸ء

پاکستان نمبر نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھولے جا جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شامل کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ۔ علاوہ محصول۔

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجیے۔ "منیجر"

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان و پاکستان کے اندر چھ روپیہ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

نوٹ: رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شائع ہوتا ہے اور اس تک اطلاع آنے پر دو بارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

مطبوعہ نگار پریس لکھنؤ۔ ایڈیٹر و پبلشر نیاز فتحپوری